ماہنامہ **میثاق** لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے — سالانہ چھ روپے

MONTHLY MEESAAQ LAHORE

JUNE, 1960

انتخاب فرمائیے

ترجمہ تفسیر قرآن مجید از مولانا محمود الحسن و مولانا شبیر احمد عثمانی رح	16/8/-
تفسیر احسن التفاسیر جلد اول از مولانا سید احمد حسن محدث دہلوی	11/-/-
تدبر قرآن تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ مولانا امین احسن اصلاحی	-/12/-
تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد کی معرکۃ الآرا کتاب	3/-/-
حضرت عمر رض کے سرکاری خطوط مولفہ ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی ایم اے	14/-/-
قادیانیت مرزائیت کا نئے انداز سے تجزیہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	4/-/-
سیرت سید احمد شہید مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی	8/8/-
عمر فاروق رض از محمد حسین ہیکل ترجمہ حبیب اشعر	20/-/-
ابوبکر رض از محمد حسین ہیکل ترجمہ شیخ محمد پانی	10/-/-
رحمۃ للعالمین مصنفہ قاضی سلیمان منصور پوری مکمل	17/-/-
تاریخ اسلام از اکبر شاہ نجیب آبادی تین حصے	36/-/-
صدیق اکبر مولانا سعید احمد اکبر آبادی	غیر مجلد 8/-/-
اشتراکی چین از پروفیسر ارشاد احمد ایم اے	5/-/-
پاکستان کا مستقبل از سعید ملک	3/-/-
تبرکات آزاد مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ	6/8/-
نقش آزاد " " "	6/-/-
مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی	2/8/-

دیگر علمی و ادبی، نایاب و کمیاب کتب ملنے کا پتہ

المکتبۃ الرحمانیہ

شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے
ارسال زر کا پتہ
مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲ | بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء مطابق ذیقعد ۱۳۷۹ھ | عدد

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ (آئین کمیشن کے سوالنامہ کا جواب) امین احسن اصلاحی ——————

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ —————— " ——————

مطالعۂ حدیث

معازف و مزامیر کا شرعی حکم —— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——————

اجتماعیات و سیاسیات

اسلامی قومیت کے عوامل —————— امین احسن اصلاحی ——————

سفر حج

چند تمہیدی باتیں —————— امین احسن اصلاحی ——————

اقتباسات و تراجم

عصمت فروشی پر اقوام متحدہ کی رپورٹ —— جناب خالد مسعود صاحب ——————

☆

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱۔ احمد سٹریٹ رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

یہ آئین کمیشن کے سوال نامہ کا جواب ہے۔ یہ جواب میں میثاق یا کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مرتب کر لینے کے بعد یہ جواب میں براہ راست کمیشن کے صدر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں گا لیکن ایک خاص ضرورت کی وجہ سے میں اس کو ان صفحات میں دے رہا ہوں۔

وہ ضرورت یہ ہے کہ لاہور سے چند علماء کے نام سے جو جواب شائع ہوا ہے اس پر مجھ سے بھی دستخط کرنے کی خواہش کی گئی تھی لیکن چونکہ اس جواب کے بیشتر حصہ سے مجھے اتفاق نہیں تھا اس وجہ سے میں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے اس انکار کو بہانہ بنا کر کچھ اصحاب الاغراض نے مختلف حلقوں میں میرے خلاف طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائیں۔ میری نسبت ایسی باتیں کہیں جو صرف ان کے اپنے ذہن کی ایجاد ہیں، حقیقت سے ان کو دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرے لیے ان حضرات کی ان شریفانہ باتوں کا جواب دینا تو ممکن نہیں ہے لیکن کمیشن کے سوالوں کے جوابات میں ان صفحات میں دے رہا ہوں تاکہ جو لوگ دستوری مسائل اور اسلامی شریعت کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اندازہ کر سکیں کہ میرا نقطہ نظر ان حضرات کے نقطہ نظر سے اتنا مختلف تھا کہ ان کے ڈرافٹ پر میرے لیے انگوٹھا لگا دینا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک میں اپنے علم اور اپنے ضمیر کی کھلم کھلا مخالفت کرنے پر آمادہ نہ ہو جاؤں اور یہ کام میں نہ کر سکا۔ میرے نزدیک اتحاد و اتفاق بڑی اچھی چیز ہے لیکن آدمی اس چیز سے کس طرح اتفاق کرے جس سے اتفاق کرنے کی کوئی گنجائش ہی

نہ ہو۔ میں نے اپنے اس عدم اتفاق کا مجلس میں اظہار بھی کر دیا تھا اور اس قسم کے عدم اتفاق کا اظہار کرنے والا تنہا میں ہی نہیں تھا بلکہ اور بھی ذی فہم اور ذی علم حضرات تھے لیکن شہرت صرف میرے اختلاف کو دی گئی تاکہ اس خانہ ساز "اجماع" سے اختلاف کرنے کے جرم میں قوم کے سامنے مجھے گردن زدنی ٹھہرایا جائے۔ (امین احسن اصلاحی)

آئین کمیشن کے سوال نامہ کے جواب میں چند باتیں ہم بھی کمیشن کے محترم ارکان کی خدمت میں عرض کرنی چاہتے ہیں لیکن ان باتوں کی نوعیت کمیشن کے شائع کردہ سوالوں کے رسمی جواب کی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسے شخص کے دل کی آواز کی ہوگی جو اس ملک کے حالات کو سیاسی طالع آزماؤں کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے صرف ایک وفادار شہری کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس کی دلی آرزو صرف یہ ہے کہ یہ ملک ہر پہلو سے ترقی کرے، اس کی حکومت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو اور یہاں ہر شعبۂ زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا قانون جاری و نافذ ہو۔ اس آرزو کی کشاکش سے ممکن ہے ہماری بعض باتیں سوال نامہ کے معین کردہ حدود سے متجاوز ہو جائیں لیکن ہمیں امید ہے کہ کمیشن کے محترم ارکان ہماری یہ بے ضابطگی یہ خیال کر کے معاف فرما دیں گے کہ ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں یہ کوئی نغمہ نہیں ہے بلکہ ایک فریاد ہے اور فریاد کسی لے کی پابند نہیں ہوا کرتی۔

ہم سب سے پہلے کمیشن کے محترم ارکان کو اس عظیم ذمہ داری کی طرف توجہ دلائیں گے جو صدر ریاست کی طرف سے ان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جس کے وہ حامل قرار پائے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس ملک کو ایک خطرناک انتشار سے بچا کر اس کی جو خدمت انجام دی ہے، ہمارے نزدیک تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہے لیکن اس اہمیت کا تمام تر انحصار اس کمیشن کے کام پر ہے۔ اگر کمیشن نے صحیح کام کرنے کی توفیق پائی، اس نے ایک ایسا دستور بنا دیا جو اس ملک کے باشندوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوا اور یہ ملک مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہو گیا تو آج اس کمیشن کے ارکان کو اس ملک کے عام باشندے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن ہماری قوم کی آیندہ نسلیں ان میں سے ایک ایک کے نام کو ہمیشہ فخر و احترام کے جذبات کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

لیکن اگر خدانخواستہ یہ کمیشن ایک صحیح قسم کا دستور بنانے میں ناکام ہو گیا تو پھر نہ تو تاریخ میں اس انقلاب ہی کی کوئی اہمیت باقی رہ جائے گی جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کے ہاتھوں برپا ہوا اور نہ اس کمیشن ہی کا نام کوئی عزت سے لے گا بلکہ ہم نہایت صدمہ اور غم کے ساتھ یہ درد انگیز حقیقت بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اس صورت میں اس ملک اور اس قوم کے مستقبل سے متعلق بھی کوئی اچھی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ جو قوم پورے ۱۳ سال ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اپنی منزل مقصود اور اپنے لیے راہِ عمل متعین نہ کر سکے گی، آخر اس کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر جگہ گھیرے رکھنے کا کیا حق حاصل ہے؟ اللہ تعالیٰ غفلتوں کی تلافی کے لیے مہلت ضرور دیا کرتا ہے، لیکن قوموں کی زندگی اور موت سے متعلق اس کے جو متعین ضابطے ہیں وہ تو بہرصورت اٹل ہیں۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

دوسری گذارش جو ہم کمیشن کے فاضل ارکان سے کریں گے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جو سوالنامہ شائع کیا ہے اگرچہ اس کے اکثر سوالات بجائے خود مفید اور ضروری نظر آتے ہیں، لیکن اصل سوال جو اس قوم سے پوچھنے کا تھا کمیشن نے وہ نظر انداز کر دیا ہے، وہ یہ کہ پاکستان میں قائم ہونے والی ریاست سے متعلق اس قوم کا تصور کیا رہا ہے؟ اس نے جان اور مال کی عظیم قربانیاں کس قسم کی ریاست قائم کرنے کے لیے دی تھیں؟ کن نظریات و عقائد اور کن خصوصیات و ممیزات پر اس ملک کی حکومت کھڑی کی جائے تو اس کے وہ خواب پورے ہو سکیں گے جو پاکستان کے مطالبہ کے روزِ اول سے وہ دیکھتی رہی ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ کمیشن نے انتظامی نوعیت کے تو بہت سے سوالات پوچھ ڈالے ہیں لیکن یہ اصل سوال جو پوچھنے کا تھا وہ اس نے نہیں پوچھا، اگر اس سوال کے نہ چھیڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا جو جواب اس قوم کے ایک ایک فرد کے دل میں اور بچہ بچہ کی زبان پر ہے کمیشن اس سے اچھی طرح باخبر ہے تو ہمیں اس کے نظر انداز کیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر یہ تغافل دیدہ و دانستہ ہے اور مقصود اس سے اس سوال کی ذمہ داریوں سے دامن بچانا ہے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سوال کی ذمہ داریوں سے دامن بچا کے اگر کوئی دستور بنانے کی کوشش کی گئی تو وہ دستور اس ملک میں کبھی کسی مضبوط حکومت کی بنیاد نہیں بن سکے گا۔

ان اصولی گذارشات کے بعد اب ہم چند باتیں کمیشن کے سوالنامہ کو سامنے رکھ کر عرض کریں گے لیکن یہ امر واضح رہے کہ کمیشن کے سوالوں میں سے ہم صرف انہی سوالوں سے دلچسپی رکھتے ہیں جو کوئی اصولی اور مقصدی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ ان سوالوں سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے جو محض انتظامی نوعیت کے ہیں اور جن کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر لیا جائے تو اس سے ہمارے نزدیک کوئی خاص خرابی انشاء اللہ واقع نہیں ہوگی۔

سوال نمبر ۱:- آپ کے نزدیک پاکستان میں جمہوری حکومت کے پارلیمانی طریقے کی بتدریج ناکامی کی نوعیت اور اس کے اسباب کیا ہیں جن کی بدولت آخر کار ۱۹۵۶ء کے دستور کی تنسیخ عمل میں آئی؟

جواب:- اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ کسی ملک میں جمہوری حکومت (طریقہ اس کا پارلیمانی ہو یا کوئی اور) کی کامیابی کے لیے دو شرطیں مسلمہ طور پر لازمی سمجھی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے عوام میں سیاسی بیداری ہو، ان کو اپنے حقوق کا اچھی طرح احساس ہو، وہ اپنے لیڈروں اور حکمرانوں کا احتساب کر سکتے ہوں اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور ان کو قائم رکھنے کے لیے جان اور مال کی قربانیاں دے سکتے ہوں۔

دوسری یہ کہ ملک میں ایک سے زیادہ ایسی منظم سیاسی پارٹیاں موجود ہوں جن کو اہل ملک کا اعتماد حاصل ہو، جن کے لیڈر مضبوط قومی کردار کے حامل ہوں اور ملک کے ساتھ جن کی وفاداری ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ جن ملکوں میں یہ دونوں شرطیں موجود پائی گئی ہیں وہاں جمہوریت نہایت کامیابی کے ساتھ چلی ہے لیکن جہاں یہ چیزیں موجود نہیں پائی گئی ہیں یا پائے جانے کے بعد کسی اسٹیج میں آکر ختم ہو گئی ہیں وہاں جمہوریت بھی یا تو پائی ہی نہیں گئی ہے یا پائی گئی ہے تو بعد کے مراحل میں آکر ختم ہو گئی ہے۔

یہ تو اس سوال کا اصولی جواب تھا اب پاکستان کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب انگریز اس ملک کو چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں تو ان کے سپرد کردہ اقتدار کی وارث اس ملک میں مسلم لیگ ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کو یہ وراثت بالکل جائز طور پر حاصل ہوئی۔ جس طرح بھارت میں کانگریس ہندو جنتا کی واحد نمائندہ تھی اسی طرح یہاں مسلم لیگ مسلمان قوم کی واحد نمائندہ تھی اور اس کے اس بلا شرکت غیرے نمائندگی کے دعوے کو اس ملک میں کوئی پارٹی چیلنج کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ مسلم لیگ کے مسلمہ لیڈر قائد اعظم محمد علی جناح

تھے۔ مسلمان قوم پر ان کا ایسا ہمہ گیر اثر تھا کہ ان کے مخالف خلوتوں میں تو ان کے اوپر تنقید کر لیتے رہے ہوں لیکن پبلک میں ایک سخت خطرہ مول لیے بغیر کوئی شخص ان پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کو جو اثر و اعتماد قوم میں حاصل تھا اس کی بنا پر وہی جائز حقدار تھے کہ انگریزوں سے اس قوم کی طرف سے اختیارات وصول کریں اور جب انھوں نے وصول کیا تو گویا بالواسطہ ان اختیارات کو پاکستان میں بسنے والی قوم نے وصول کیا۔[1]

اس اقتدار کے حاصل کرنے کے بعد اس ملک میں جمہوریت کے چلانے کی ساری ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد ہوتی تھی لیکن مسلم لیگ کی بنیادی کمزوری یہ تھی کہ اس کی قیادت میں قومی کردار رکھنے والے لیڈر صرف دو تھے۔ ایک قائدِ اعظم محمد علی جناح، دوسرے لیاقت علی خاں مرحوم۔ ان دو کے سوا لیگ کی پوری قیادت میں، (ایک آدھ مرنجاں مرنج قسم کے آدمیوں کو چھوڑ کر) ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جا سکے۔ یہ قیادت زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جو بالکل خود غرض اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگ تھے۔ یہ تو محض قائدِ اعظم کا زور اور اقتدار تھا کہ انھوں نے ان بے کردار اور بگ ٹٹ قسم کے لوگوں کو قابو میں رکھ چھوڑا تھا۔ پاکستان کے قیام کے تھوڑے عرصہ بعد جب قائدِ اعظم وفات پا گئے اور پھر کچھ مدت کے بعد لیاقت علی خاں مرحوم شہید کر دیئے گئے تو مسلم لیگ کی قیادت بالکل کھوکھلی ہو کر رہ گئی۔

---

[1] ہم ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے جو آج ہماری قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس ملک میں اقتدار کبھی قوم کی طرف منتقل ہی نہیں ہوا بلکہ اس کو بالا بالا کچھ غاصبین اچک لیتے رہے ہیں اور اب بھی اسی طرح کے غاصبین ہی ہیں جو اس اقتدار کو غصب کیے ہوئے ہیں۔ یہ تاثر رکھنے والوں اور یہ تاثر دینے والوں کے نزدیک غالباً قوم سے مراد ان کی اپنی ذات اور ان کے اپنے گنتی کے چند اتباع ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا تصورِ قوم یہ ہوگا تو ان کو اقتدار نہ ملنے کے معنی ان کے نزدیک یہی ہوں گے کہ یہ پوری قوم ہی اقتدار سے محروم رہی۔ مثل مشہور ہے کہ ہم بھوکے تو جگ بھوکا۔ اس انتقالِ اقتدار کی حقیقت پر اس بات سے کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل کے تاج برطانیہ کے نائب تھے۔ یہ ایک بالکل رسمی چیز تھی جس سے آزادی اور اقتدار کے انتقال کا وہ واقعہ جھوٹا نہیں ہو سکتا جو اگست ۱۹۴۷ء میں پیش آیا تھا۔

میں جو لوگ حکومت کے سربراہ کار رہے بدقسمتی سے وہ بھی اپنے عہدہ کی حرمت برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس گندے کھیل سے بالاتر رہ کر ملک کے آئین اور اس کے دستور کی حفاظت کرتے لیکن وہ خود بھی اسی کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ بالخصوص غلام محمد صاحب مرحوم کی روش بڑی ہی مایوس کن رہی۔ ان کے غیر آئینی اقدامات سے ملک کے وقار اور اس کی آئینی ترقی کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچے۔ اگرچہ ہمارا یہ خیال نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، کہ ان کا سروسز کے ساتھ کوئی ساز باز تھا، وہ نہ تو عام معنی میں سروسز کے آدمی تھے اور نہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ ہم ان کے افعال کی ذمہ داری پاکستان کی سروسز کے لوگوں پر ڈالیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طرز عمل نے اس ملک کے جمہوری اقدار کو بڑا شدید صدمہ پہنچایا۔

خربوزہ خربوزے سے رنگ پکڑتا ہے اور ایک فتنہ سے دوسرے فتنے کو راہ ملتی ہے۔ لیگ کا انتشار اور اس کی قیادت کی ناکامی نے بہت سے فتنوں کے دروازے کھول دیے۔ سرحد، بلوچستان اور مشرقی پاکستان میں کھلم کھلا ایسے نعرے بلند ہونے لگے تھے جو ملک کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے والے تھے۔ ملک کے اندر نہ کوئی ایسا معتمد علیہ لیڈر رہ گیا تھا جو لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکے اور نہ کوئی ایسی سیاسی پارٹی موجود تھی، جو صحیح قومی نصب العین پر عوام کو جمع کر سکے اس وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا کہ علاقائی تعصبات بھڑکا کر انتشار پسند لیڈر جگہ جگہ ایسے فتنے کھڑے کر دیں گے جو خدانخواستہ پاکستان ہی کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ ہونے والے انتخابات میں جو پارٹیاں میدان میں اتر رہی تھیں ان کا کردار، ان کا قول اور ان کا عمل سب کچھ آزمایا ہوا تھا۔ ان کے نعرے تمام تر جذباتی اور انتشار انگیز تھے، لیکن عوام اپنی بے شعوری کے سبب سے انہی کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ جو پارٹیاں مذہبی نعروں کے ساتھ اٹھی تھیں ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں بن سکی تھی کہ یہ میدان کی غالب اور حاوی پارٹیوں کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں کہ شاید ان کی نظر کرم کے فیض سے ان کے خوان کرم کا کوئی ٹکڑا ان کی جھولی میں بھی پڑ جائے۔

یہ حالات تھے کہ ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کا وہ انقلاب ظہور میں آیا جس نے دستور کو منسوخ کر دیا اور اس ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی[1] (باقی ص۵۱ پر)

[1] بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب بھارت میں جمہوریت پوری کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے (باقی حاشیہ ص۵۱ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۱۱)

۲۷ - اس مجموعۂ آیات کی تعلیمات

یہ مجموعۂ آیات جن حقائق پر مشتمل ہے ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف ہم الفاظ اور جملوں کی تشریح کرتے ہوئے اشارے کر چکے ہیں۔ یہ اشارے ہمارے نزدیک رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اس کے اندر بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا اصل مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؟ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ مجبور ہے یا با اختیار؟ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں در آیا ہے؟ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی کوئی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے؟ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی ہی عقل و فہم کافی ہے یا اس کے علاوہ وہ کسی اور مافوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے؟ اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی؟ اس کے اندر جو بدی پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ غرض اس طرح کے بہت سے بنیادی سوالات ہیں جن کے جواب ان آیات کے اندر موجود ہیں۔ اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

خلافت اور اس کے مقتضیات ان آیات سے پہلی حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے الفاظ میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے۔ اس خلافت و نیابت کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کچھ لازمی تقاضے ہیں

حسن کے پورے ہوتے بغیر خلافت کا تصور مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے نزدیک یہ تقاضے بالاجمال یہ ہیں:

ایک یہ کہ انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار تفویض ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر و ناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد اور کسی کی اعانت کی محتاج نہ ہو جسے کہ ایک پل کے لیے بھی اپنی مملکت کے امور و معاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو اپنا خلیفہ یا نائب بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے، ان کو اپنے مستخلف کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا اس کی مرضی سے بے پروا ہو کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب انسان خلیفہ اور نائب ہے تو یہ عین اس کی خلافت اور نیابت کا اقتضا ہے، کہ مستخلف کی طرف سے اس کی آزادی کے حدود متعین و معلوم ہوں، اس کو واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہو کہ کن امور میں اس کو اپنے مستخلف کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنی ہے اور کن امور میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعبیر اگر کی جائے تو یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ عین خلافت و نیابت کی فطرت کا اقتضا ہے کہ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے شریعت و ہدایت نازل ہو۔

تیسرا یہ کہ جب انسان خدا کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحب قدرت اور علیم و خبیر مستخلف اپنے خلیفہ کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اپنے خلیفہ کی ایک ایک بددیانتی اور ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا اور اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیئے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

چوتھا یہ کہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو، غیر مشروط نہ ہو۔ یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے، ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے، لیکن یہ اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حقدار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں، جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں

بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

چھٹا یہ کہ یہ خلافت خیر و فلاح کی ضامن اسی وقت تک ہو سکتی ہے، جب تک یہ اصل مستخلف کے احکام و ہدایات کے مطابق چلائی جائے۔ اگر اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر انسان اس کو اپنی خواہشات کے مطابق چلانے کی کوشش کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس زمین میں خون ریزی اور فساد برپا ہو۔

انسان کی برتری دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور ابلیس اس کو سجدہ نہ کرنے ہی کے سبب سے ملعون ہوا تو یہ بات کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ جنات یا فرشتوں میں سے کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر ان کی پرستش کرے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کے آگے جس طرح انسان عاجز و بے بس ہے اسی طرح فرشتے اور جنات بھی عاجز و بے بس ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے وہ بھی خود ان کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ تمام تر اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انسان علم میں فرشتوں سے بھی بازی لے جا سکتا ہے اس وجہ سے بندگی اور پرستش کا حقیقی حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان اگر اس حق میں اللہ تعالیٰ کے سوا جنوں اور فرشتوں کو بھی شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توہین نہیں کرتا بلکہ خود اپنی بھی توہین کرتا ہے۔

گناہ کا سرچشمہ تیسری حقیقت ان آیات سے یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم اور فسادی وجود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اچھی صلاحیتوں اور نہایت اعلیٰ قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ اگر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی ازلی و ابدی گنہگار ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اختیار کی اس نعمت کو جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مشرف فرمایا ہے، غلط استعمال کرنے کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ میں اس کو شیطان مبتلا کرتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی وسیع آزادی پر جو چند پابندیاں عائد کر دی ہیں، شیطان انسان کو ورغلاتا ہے کہ یہ

یہی پابندیاں ہیں جو اس کے سارے عیش و آرام کو کرکرا کیے ہوئے ہیں، اگر وہ ان کو جرأت کرکے توڑ دے تو بس اس کے لیے ترقی و کمال اور عیش و آرام کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ شیطان کے ان مشوروں کا فائدہ چونکہ انسان کو نقد نقد نظر آتا ہے اس وجہ سے وہ اس کے جھکیے میں آجاتا ہے اور اپنی فطرت کے اعلیٰ تقاضوں کے خلاف گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھولی ہے۔ چنانچہ حضرت آدم سے جو لغزش صادر ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی۔ اس کے بعد ان کو اس دنیا میں جو بھیجا تو اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے۔

قرآن کے اس بیان سے عیسائیوں کے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو جاتی ہے جو آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے سے متعلق ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور جس کے حل کے لیے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ گھڑا ہے۔

خدا کے ہر کام میں حکمت ہے چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ خدا کی ہر بات کے اندر نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے جب تک اللہ تعالیٰ ہی واقف نہ کرے نہ ان سے جنات واقف ہو سکتے، نہ فرشتے اور نہ انسان۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے کاموں کے بارے میں صحیح روش انسان کے لیے یہ ہے کہ ان کی حکمتیں معلوم کرنے کی کوشش تو برابر کرتا رہے لیکن اگر کسی چیز کی حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ہدف اعتراض و مخالفت نہ بنا لے بلکہ یہ حسن ظن رکھے کہ اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی لیکن اپنے علم کی کمی کے سبب سے وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ یہی روش اختیار کرکے انسان ایمان و اسلام کے جادہ پر استوار رہ سکتا ہے اور یہی روش فرشتوں کی روش ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے نہایت قلیل اور محدود علم کو خدا کے علم اور اس کی حکمتوں کے ناپنے کا پیمانہ بنا بیٹھتے ہیں تو وہ اسی قسم کی خودسری اور انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس قسم کی خودسری اور انانیت میں ابلیس مبتلا ہو گیا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایمان و معرفت کے راستے کھلتے نہیں بلکہ جو راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جایا کرتے ہیں۔

آدمؑ اور ابلیس کے گناہ میں فرق پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو گناہ انسان کے محض ارادہ کی کمزوری سے صادر ہوتا ہے اس کا مزاج اس گناہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کا سرچشمہ حسد اور تکبر ہوتا ہے۔ ضعف ارادہ سے صادر ہو جانے والے گناہ کے بعد توبہ اور اصلاح حال کی توقع بہت غالب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو، اگر وہ بالکل ہی اپنے آپ کو چھوڑ نہیں بیٹھتے ہیں سنبھالتا ہے اور ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کی بیماری بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اصلاح پذیر ہونے کے بجائے بالعموم اپنے مرشد — ابلیس — ہی کی راہ پر جیتے اور اسی پر مرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کا گناہ پہلی قسم کا تھا اس وجہ سے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور ابلیس کا گناہ دوسری قسم کا، اس وجہ سے وہ توبہ اور اصلاح سے محروم رہا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔

نبوت و رسالت کی ضرورت چھٹی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے بہکانے کی مہلت دے کر انسان کو اس دنیا میں ایک سخت امتحان میں ڈالا ہے اس وجہ سے اس کی رحمت مقتضی ہوئی کہ وہ انسان کی ہدایت اور اصلاح کے معاملہ کو تنہا اس کی عقل و فطرت ہی پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی فطرت کو بیدار رکھنے اور اس کی عقل کو لغزشوں اور گمراہیوں سے بچانے کا بھی سامان کرے تاکہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرنا چاہیں وہ بھی علیٰ وجہ البصیرۃ اختیار کریں اور جو گمراہی کی راہ پر جانا چاہیں وہ بھی پوری طرح اتمام حجت کے بعد جائیں۔ نبوت و رسالت کے قیام سے اصل مقصود یہی چیز ہے اور اس امتحان گاہ عالم میں انسان کے لیے اصل سرمایہ تسکین و تسلی درحقیقت یہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ اگر یہ چیز انسان سے چھن جائے تو پھر انسان ہر فتنہ کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی فطرت کے اندر جو خلا ہے وہ صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی پیروی سے ہی بھر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر انسان کے لیے شیطان کے فتنوں سے مامون ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۸ - آگے کا سلسلۂ کلام

شروع سورہ سے لے کر یہاں تک کا پورا سلسلہ کلام ایک تمہید یا مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تمہید میں خطاب اگرچہ بیشتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے، اس میں کہیں براہ راست یہود کو مخاطب

کر کے کوئی بات ان سے نہیں کہی گئی ہے لیکن اشارات وکنایات کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ہماری پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ یہ وہ تمام تر یہود ہی سے متعلق۔ اب یہ تمہید ختم ہو گئی۔ آگے یہود کو براہ راست مخاطب کر کے پہلے ان کو ان کی وہ ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں جو از روئے تورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی دعوت سے متعلق ان پر عاید ہوتی ہیں، پھر تفصیل کے ساتھ ان کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصب امامت سے معزول کر کے دوسروں کو اپنی ہدایت وشریعت سونپے۔ یہ مضمون تقریباً اس سورہ کے آدھے حصہ پر حاوی ہے اور اس میں دعوت وملامت کے بعد ان کی معزولی کے وجوہ کی پوری تفصیل نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ اب ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر اس کی تفصیل کریں گے۔ فرمایا:-

یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا
بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا
بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ
اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاسْتَعِیْنُوْا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ
یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو۔ میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ اور مجھی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے

تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے ہی غضب سے بچتے رہو اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے درانحالیکہ تم جانتے ہو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو، کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں، جو گمان رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

تفسیر آیۃ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ چھپ کے تیار ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ تدبر قرآن سے مشتمل بر تفسیر آیۃ بسم اللہ و تفسیر سورہ فاتحہ چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کو ہر روز نمازوں میں بار بار پڑھتا ہے لیکن اس آیت اور اس سورہ کے حقائق بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ اس تفسیر کو خود بھی پڑھیے اور اپنے دوسرے دوستوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیجیے، اِنْ شَآءَ اللّٰہ اس کے مطالعہ سے آپ پر ان دونوں قرآنی ٹکڑوں کے اسرار بھی واضح ہوں گے اور قرآن پر غور کرنے کی عقلی اور فطری راہ بھی کھلے گی۔

اس کے مؤلف امین احسن اصلاحی ہیں اور قرآن میں ان کا جو طرز فکر ہے اس سے میثاق کے پڑھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔

کتاب میثاق کے سائز پر اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ چھپی ہے اور قیمت ۱۲/ قرار پائی ہے۔

منیجر مکتبۂ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور

مطالعۂ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

معازف و مزامیر کا شرعی حکم

(۲)

سنن ابوداؤد کی روایت | صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد کی روایت ہے:

عن نافع سمع ابن عمر مزماراً قال فوضع اصبعیه من اذنیه وقال كنت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فسمع مثل هذا فصنع مثل هذا۔

نافع سے روایت ہے عبداللہ بن عمرؓ نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کان، انگلیوں سے بند کر لیے اور فرمایا میں (ایک بار) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا آپ نے اسی طرح آواز سنی اور یہی طرز عمل اختیار کیا۔

(ابوداؤد مع عون المعبود ج ۴ ص ۴۳۲ کتاب الادب)

اس روایت کو امام ابوداؤد نے منکر قرار دیا ہے، لیکن منکر ہونے کی وجہ کوئی بیان نہیں کی۔ سنن ابوداؤد کی مشہور مستند شرح عون المعبود میں لکھا ہے:

"اس روایت کے منکر قرار دیے جانے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، اس حدیث کا کوئی راوی بھی اپنے سے کسی ثقہ تر راوی کا مخالف نہیں ہے۔"

امام سیوطیؒ نے ابن عبدالہادی کا قول نقل کیا ہے کہ اس روایت کو سلیمان بن موسیٰ کی وجہ سے محمد بن طاہر نے ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ سلیمان بن موسیٰ کو متعدد اہل علم نے ثقہ اور حسن الحدیث راویوں میں شمار کیا ہے، پھر اس کی متابعت و تائید میں مسند ابو یعلیٰ اور طبرانی کی روایات موجود ہیں۔ (عون ج ۴)

ایک ضروری وضاحت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عبداللہ بن عمرؓ کا بانسری کی آواز سن کر کان بند کر لینے سے مقصود صرف شدید نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار تھا، اس قسم کے مواقع پر کانوں میں انگلیاں

ٹھونس لینا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اصل میں کان لگا کر سننا منع ہے۔ اگر اتفاقاً گانے بجانے کی آواز کان میں پڑ جائے تو اس سے گناہ لازم نہیں آتا۔ جس طرح کہ نامحرم عورت پر اچانک بلا ارادہ نگاہ پڑ جائے تو خدا کے ہاں کوئی مواخذہ نہ ہوگا، لیکن بالقصد اور بالارادہ تاک جھانک کرنا قطعاً حرام ہے اس پر شدید وعید آئی ہے اور اسے آنکھ کا زنا قرار دیا گیا ہے۔

چند کمزور سہارے | مذکورہ بالا صفحات میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تصریحات سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ اسلام میں معازف و مزامیر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب ان دلائل و شواہد کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو حامیان موسیقی کی طرف سے معازف و مزامیر کے جواز بلکہ مستحب اور مستحسن ہونے پر پیش کیے جاتے ہیں۔

قرآن سے استدلال | قرآن میں ہے ولقد آتينا داود زبورا، اس آیت کی تشریح اور تائید میں بائبل میں سے زبور کی یہ عبارت پیش کی گئی ہے۔

"نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔ تاردار سازوں اور بانسری کے ساتھ اس کی حمد کرو، زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو۔" (زبور باب ۱۵۰ آیت ۳ تا ۵)

اس سے انکار نہیں کہ موجودہ بائبل میں بہت سی حکمت و دانائی کی باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صحیح روایات و آثار سے جن چیزوں کی کراہیت و حرمت ثابت ہو چکی ہے، ان کو بائبل کی روایات کی بنا پر جائز بلکہ سنت داؤدی قرار دے دیا جائے۔

اگر یہ دروازہ ایک مرتبہ کھول دیا گیا تو رہزنی، شراب خواری، قماربازی، زناکاری اور بت پرستی سب کے جواز کا فتویٰ بھی دینا ہوگا کیونکہ موجودہ بائبل میں تو نعوذ باللہ نوح علیہ السلام، لوط علیہ السلام، ہارون علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان کی طرف ان اخلاقی جرائم اور سیاہ کاریوں کو بھی منسوب کیا گیا ہے، حوالے کے لیے ملاحظہ ہو بائبل کتاب پیدائش باب ۹، باب ۱۹، کتاب خروج باب ۳۲، صموئیل کتاب ۲ باب ۱۱، کتاب سلاطین باب ۱۱ یوحنا باب ۱

حدیث کا سہارا | صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا

لقد اعطيت مزمارا من مزامير آل داود — اے ابوموسیٰ تمہیں آل داؤد کے مزامیر میں سے مزمار عطا ہوا ہے

اس حدیث کی تشریح میں ایک صاحب کہتے ہیں "اس سے مراد "تلاوت کا ایسا انداز ہے" جس میں موسیقیت کی جھلک ہو، کچھ سُر ہو، کچھ لے ہو، اس کے لیے ایک جامع لفظ تغنی ہے لیکن اگر یہ تشریح صحیح ہے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ لیجئے مزمار کا ثبوت بھی سنت داؤدی اور سنت محمدی دونوں سے مل گیا۔

حقیقت میں نہ یہاں "تغنّی" سے نہ موسیقیت اور نہ راگ الاپنے کی حمایت، اس سے تو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی مؤثر اور پرکشش خوش الحانی کا اظہار و اعتراف مقصود ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے اِنَّ مِنَ البیان لسحراً (بلا شبہ کچھ بیان و خطاب جادو کا سا اثر رکھتے ہیں) کیا اس تشبیہ کی بنا پر اس سے سحر و ساحری کا جواز نکالا جا سکتا ہے؟

روایات کا سہارا | معازف و مزامیر اور گانے بجانے کی حمایت میں بخاری کی بھی دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور میرے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت دو لڑکیاں جنگ بُعاث کے گانے گا رہی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹ گئے اور دوسری طرف کروٹ لے لی اور چہرہ مبارک پھیر لیا۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ شیطانی گیت؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا، ان کو رہنے دو، یہ عید کا دن ہے۔

اس روایت میں چند امور تنقیح طلب ہیں (۱) غناء اور تغنی کے معنی، (۲) جاریہ کا مفہوم (۳) اشعار کی نوعیت، (۴) حضرت ابوبکرؓ کے ٹوکنے اور منع کرنے کی بنیاد

غنا یا تغنی محض گانے ہی کے لیے نہیں آتے بلکہ بلند آواز سے پڑھنے کے معنی بھی ان کے لیے

۱؎ حضرت داؤد علیہ السلام کو موسیقار اور مغنی ثابت کرنے کے لیے مسند عبدالرزاق وغیرہ کی روایات ہی پیش کی گئی ہیں لیکن مسند عبدالرزاق جیسی کتابوں کا شمار تیسرے طبقے میں ہوتا ہے اس طبقے کا سرمایۂ حدیث ہر قسم کی رطب و یابس، غث و سمین روایات سے بھرا ہوا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کی جن احادیث سے حرمت معازف و مزامیر ثابت ہوتی ہے ان کے مقابلہ میں ان کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔

گئے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

ما اذن اللہ لشئ کاذنہ لنبی یتغنی بالقرآن یجھر بہ

مشکوٰۃ ج ۱ صفحہ ۱۹۰ بحوالہ بخاری مسلم

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو توجہ سے نہیں سنا جتنی توجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنا۔

غناء کا لفظ خوش الحانی کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے، من لم یتغن بالقرآن فلیس منا۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۹۰ بحوالہ بخاری

اسی حدیث کی تشریح میں امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد تحسینِ قرأت ہے، اسی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے "زینوا القرآن باصواتکم" مشکوٰۃ صفحہ ۱۹۱، بحوالہ ابوداؤد یعنی قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو۔ ان احادیث کی تشریح میں ابن الاثیر لکھتے ہیں۔ کل من رفع صوتہ و والاہ فصوتہ عند العرب غناء۔ (عربوں کے نزدیک بلند آواز سے تسلسل کے ساتھ پڑھنے کو غناء کہا جاتا ہے۔)

یہی ابن الاثیر زیر بحث حدیث کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

وعندی جاریتان تغنیان بغناء بعاث ای تنشدان الاشعار التی قیلت یوم بعاث ولم ترد الغناء المعروف بین اھل اللھو واللعب وقد رخص عمر فی غناء الاعراب وھو صوت کالحداء

نہایہ ج ۳ صفحہ ۱۷۳

"عندی جاریتان تغنیان" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دو نوعمر لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو جنگ بعاث کے موقع پر (شجاعت و بہادری کے اظہار کے لیے) کہے گئے تھے، اس سے وہ گانا مراد نہیں ہے جو لہو و لعب کے رسیا لوگوں کے ہاں رائج ہے۔ حضرت عمرؓ نے بدوؤں کو بھی غناء کی اجازت دی تھی وہ بھی حدی خوانی کی طرح ایک آواز ہے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

از صحیح بخاری الجہاد تغنیان گفتہ اند ولیسا بمغنیتین، یعنی غنا میکردند و ذات آنہا مغنی نبود کہ غنا حرفت آنہا باشد و غنا را خوب تواند گفت و مشہور و معروف بداں باشند و تشویق بفاحشہ و تعریض بہوا کنند کہ داعی بفتنہ و فساد بود بلکہ دختر کان بودند از اہل خانہ چنانکہ در جائے

چیزے میگویند، اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۶۴۰

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ دو لڑکیاں گھر میں جنگ کے بہادرانہ کارناموں پر مشتمل اشعار پڑھا کرتی تھیں لیکن وہ پیشہ ور مغنیہ نہ تھیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو عشق و محبت کے جذبات کو بھڑکانے والی ہو یا کسی فتنہ و فساد کا موجب بنے"

افسوس ہے کہ "ثقافت" کے مقالہ نگار نے یہ حدیث تو نقل کر دی لیکن "لیستا بمغنیتین" کے الفاظ نظر انداز کر گئے۔ علمی تحقیقات کے میدان میں اصحاب علم کو اس قسم کے مشکوک طرز عمل سے بالاتر ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ غناء یا تغنی کے دو معنی ہیں (۱) بلند آواز سے خوش الحانی کے ساتھ اشعار پڑھنا (۲) فن موسیقی کے قواعد کے مطابق آواز کے اتار چڑھاؤ کے کرتب کا پرتکلف مظاہرہ کرنا۔ شریعت اسلامی نے جس چیز کو گوارا کیا ہے وہ پہلا مفہوم ہے۔ آخر الذکر معنی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے ساتھ اگر ساز بھی شامل ہو جائے (چاہے سوز ہو یا نہ ہو) تو اس کے شراب دو آتشہ بننے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

تغنی کی طرح قرآن میں لفظ تزکیہ ملتا ہے، اس کے دو مفہوم ہیں (۱) پاک بننا، پاک بازی اختیار کرنا۔ (۲) پاک کہلانا اور نیکی اور پارسائی کا مظاہرہ کرنا۔ پہلے مفہوم کو مقام مدح میں بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے، قد افلح من زکّٰھا (فلاح پائی جس نے نفس کو پاک کیا) لیکن دوسرے معنی کو اپنانے سے روکا گیا ہے فرمایا لا تزکوا انفسکم (اپنی پاکبازی کی نمائش نہ کرو)

(ب) لفظ "جاریہ" کی تشریح میں علامہ عینی لکھتے ہیں الجاریۃ فی النساء کالغلام فی الرجال ویقال علی من دون البلوغ منھما، عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۶ ص ۲۶۸

(یعنی عورتوں میں جاریہ نابالغ بچی کو کہتے ہیں جس طرح غلام کا لفظ مردوں میں نابالغ لڑکے پر بولا جاتا ہے۔)

(ج) اشعۃ اللمعات کی مذکورہ بالا عبارت سے ان اشعار کی نوعیت بھی معلوم ہو گئی جو یہ لڑکیاں پڑھ رہی تھیں، ان میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو سفلی جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتی جیسا کہ آج کل موسیقی کی محفلوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے اور جن کے جواز کے لیے قرآن و حدیث سے دلائل جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(د) حضرت ابوبکرؓ کا اس موقع پر ٹوکنا ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اتنی احتیاط ملحوظ تھی کہ بلند آواز سے اجتماعی رنگ میں اشعار پڑھنا پڑھانا بھی ان کو گوارا نہ ہوا، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ پہلے سے آنحضورؐ کی زبان رسالت سے غناء کی مذمت سنی ہوگی تب ہی تو انھوں نے اسے مزمور الشیطان کہہ کر تنبیہ فرمائی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ کے مزمور الشیطان کہنے پر سکوت اختیار کرنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس قسم کا مشغلہ پسندیدہ نہ تھا ——— اس حدیث کی تشریح میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں :-

"حضرت ابوبکرؓ کا اس موقع پر ٹوکنا ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے غناء کی مذمت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی جس کی بنا پر ان کا خیال تھا کہ یہ ممانعت عمومی طور پر ہر موقع کے لیے ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے واضح کر دیا کہ عید جیسے خوشی کے مواقع پر اس قسم کے تفریحی مشغلے پر قدغن لگانا اور تشدد برتنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ آپ کا اعراض اور بے التفاتی ظاہر کر رہی ہے کہ گھر کے ذمہ داروں اور بزرگوں کو ایسے مشاغل سے بالاتر رہنا ہی بہتر ہے" تفسیر روح المعانی ج ۲۱ ص ۶۷

صحابہ کے طرز عمل کی وضاحت تغنی کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد ان روایات کا مفہوم بھی واضح ہو گیا جن میں بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت براء بن مالک وغیرہ کی طرف "تغنی" کی نسبت کی گئی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث سے خوشی کے مواقع پر خوش آوازی سے اچھے مضمون کے اشعار اگر گھر کی لڑکیاں پڑھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر اگر گھر کی لڑکیاں اعلان اور خوشی کے اظہار کے لیے دف کا بھی استعمال کر لیں تو اسے گوارا کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ دوسری روایت سے ظاہر ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کی تصریح مذکورہ بالا احادیث کی وضاحت کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :-

"ہاں آپؐ نے شادی وغیرہ میں عورتوں کو دف بجانے کی اجازت دی ہے، رہے مرد تو آپ کے زمانہ میں کوئی مرد بھی نہ ڈھول بجاتا تھا نہ تالیاں پیٹتا تھا۔"

بلکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ——— تالی بجانا (یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) عورتوں کے لیے ہے اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا مردوں کے لیے ہے (یعنی اگر

امام نماز میں بھول جائے اور اس کو متنبہ کرنا ہو تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ متنبہ کردیں) بلکہ آپؐ نے مردوں سے تشبہ اختیار کرنے والی عورتوں پر اور عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت کی ہے۔

اس حدیث یعنی (زیر بحث روایت) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب اس قسم کے سماع کے عادی نہ تھے۔ اسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے اسے شیطان کی آواز قرار دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کو ان کے حال پر اس لیے رہنے دیا تھا کہ وہ عید کا دن تھا اور بچوں کو ایسے موقع پر کھیل کود کی اجازت دے دی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا، "تاکہ مشرکین جان لیں کہ ہمارے دین میں آسانی ہے"۔ اور معلوم ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ رسالہ وجد و سماع ص ۲۶

ایک ضروری وضاحت روایات میں شادی بیاہ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ دف بجانے کا جواز نکلتا ہے، تاکہ اس طرح اعلان سے نکاح اور زنا کے درمیان امتیاز ہوسکے۔ اب یہ اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہوگا کہ دف پر قیاس کرکے دوسرے ہر قسم کے باجے اور آلاتِ طرب جائز ٹھہرا لیے جائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کو خارش کی بنا پر ریشمیں لباس کی اجازت دی گئی تھی۔ اب کوئی اور "ثقافت" کے بزرگ عام حالات میں بھی مردوں کے لیے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیں تو کیا یہ انصاف کے مطابق ہوگا؟

جس طرح دین میں تنگی ممنوع ہے اسی طرح اس قسم کا توسّع اور تجدد بھی جائز نہیں ہے جس سے دین میں تحریف کا دروازہ کھل جائے۔

یہ بھی واضح رہے کہ عرب میں بعثتِ نبوی کے وقت دف کے علاوہ دوسرے آلاتِ طرب بھی رائج تھے جیسا کہ عربی زبان کی مستند لغات اور ادبی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں مسلمانوں سے صرف دف کا استعمال ہی منقول ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پاک معاشرے میں خوشی کے مواقع پر بھی تفریح کی رنگارنگی اور بوقلمونی درست نہیں سمجھی جاتی تھی۔

فقہاء کا یہ اصول کتنا حکیمانہ ہے کہ وہ احادیث جو اقوالِ نبوی پر مشتمل ہیں ان کی حیثیت عام قانون کی سی ہوگی، اور واقعاتی روایات صرف اپنے مندرجات ہی میں محدود رہیں گی، عموم و اطلاق

کے لحاظ سے ان کا وہ درجہ نہ ہوگا جو قولی احادیث کو حاصل ہے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں: لان الفعل لاعموم له۔ ارشاد الفحول ص ۳۶

اسلاف میں سے بعض اہلِ علم شادی بیاہ کے مواقع پر بھی دف کو مکروہ سمجھتے ہیں، اس طرزِ عمل کی بنیاد شریعت کا وہ ضابطہ ہے جسے "سدِ باب ذریعہ" کہا جاتا ہے یعنی بعض مباحات پر اس وجہ سے پابندی لگا دی جاتی ہے کہ اس سے معاشرہ میں حرام مشاغل کے نشوونما پانے کے لیے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔

جیسے آپس میں ہدیے، تحفے دینا لینا مسنون ہے لیکن کسی سرکاری افسر یا جس سے قرض لیا ہو، اس کو تحفے دینا یا اس کی خدمت میں ڈالیاں پیش کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس طرح رشوت اور سود کے لیے راستہ ہموار ہوجاتا ہے اور معاشرے کی اجتماعی زندگی فساد اور انتشار کا نشانہ بن جاتی ہے۔

اسی طرح نامحرم عورت کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہونا اور حسین چہروں کو "قصداً" دیکھنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ اس سے زنا اور لواطت کے جرائم معاشرے میں پھیلتے ہیں، حالانکہ اس موقع پر کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نظارہ بازی سے ہم خدا کی قدرت اور اس کی صنعتِ خالقیت کا مشاہدہ کرتے ہیں (اور اس طرح ایمان و عرفان کو تازگی اور قلب و روح کو نئی زندگی حاصل ہوجاتی ہے)

(اعلام الموقعین ج ۲ ص ۶۲ از علامہ ابن قیم)

چند شبہات کا ازالہ موسیقی اور معازف و مزامیر کی حرمت پر چند شبہات بھی پیش کیے جاتے ہیں ذیل میں یہ شبہات مع جواب درج ہیں تاکہ اس بحث کا کوئی پہلو بھی تشنہ اور نامکمل نہ رہنے پائے۔

(۱) واقعی اگر معازف و مزامیر ایسی ہی شدید وعید کے موجب تھے تو ان کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں آیا

(۲) بعض صحابہ، تابعین اور سلفِ صالحین سے معازف کے استعمال یا سماعِ غناء کا ثبوت ملتا ہے اس کی کیا توجیہ کی جائے گی۔ (باقی آئندہ)

بقیہ عصمت فروشی پر اقوام متحدہ کی رپورٹ

جسے بند کرنے کے لیے اس کا تقرر کیا گیا تھا۔ پوری رپورٹ پڑھ جانے کے بعد بھی قاری کے ذہن میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ یہ تجاویز انسانیت کے دامن سے ناپاک اور مکروہ دھبے کو اتارنے کا معجزہ آخر کس طرح دکھا سکیں گی۔ کاش رپورٹ اپنے لائحہ عمل کے متعلق کے ان روشن امکانات کا جائزہ بھی لگے ہاتھوں لے لیتی!

اجتماعیات و سیاسیات

امین احسن اصلاحی

اسلامی قومیت کے عوامل

علمائے سیاست، ریاست کا تدریجی ارتقاء اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے اجتماع سے معاشرہ وجود میں آتا ہے، معاشرہ اپنے ایک خاص دور میں قومیت کا روپ دھارن کرتا ہے اور جب قومیت اپنے سیاسی شعور کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ اس کے تمام افراد ایک بالاتر اقتدار کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ریاست وجود میں آجاتی ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اگر کوئی شخص ریاست کے اوصاف اور اس کی خصوصیات سمجھنا چاہتا ہے تو اسے اس سے پہلے معاشرہ اور قومیت کی حقیقت اور ان کے اوصاف و خصوصیات پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا ہو گا۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، اس کے مختلف اجزاء میں کن چیزوں سے اشتراک و اتحاد پیدا ہوتا ہے، کیا محرکات ہیں جو ان میں باہم ربط و اتصال کا جذبہ پیدا کرتے اور ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار پر اُبھارتے ہیں تو اس سے خود ریاست کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں اتصال و اشتراک کی نوعیت اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی۔ قومیت اور ریاست میں وہی نسبت ہے جو نسبت بنیاد اور عمارت میں ہے۔ اگر بنیاد کا پورا نقشہ واضح ہو تو اصل عمارت کی نوعیت سمجھ لینے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ بالخصوص عمارت کے استحکام اور اس کی غایت کے نقطۂ نظر سے اگر اس کا جائزہ لینا ہو تو پھر تو دیکھنے اور سمجھنے کی اصل چیز بنیاد ہی ہے نہ کہ عمارت۔ اس وجہ سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ قومیت کن عوامل کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے، ضعف اور قوت کے لحاظ سے ان کے کیا درجے ہیں، ان عوامل سے متعلق جدید اور قدیم نظریات میں کیا

اختلاف ہے۔ پھر اس امر پر غور کریں گے کہ ایک عام قومیت اور ایک اسلامی قومیت میں کیا فرق ہے اور ان دونوں سے پیدا ہونے والی ریاستوں کے مزاج اور ان کے اطوار پر اس فرق کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں؟

قومیت کے عوامل قومیت چند چیزوں کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے۔ نسل، زبان، جغرافی یک جائی، روایات اور مذہب۔

انسانوں کے کسی گروہ میں اگر یہ چیزیں مشترک ہوں اور اس کے افراد میں ان کے اشتراک کا شعور بھی زندہ ہو تو قدرتی طور پر وہ ایک دوسرے کی ہمدردی و حمایت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں، رنج و راحت اور دکھ سکھ میں اپنے کو ایک دوسرے کا شریک خیال کرتے ہیں اور زندگی کے مسائل پر ایک ہی طرز پر سوچتے ہیں۔

نسل کا اشتراک حمایت و حمیت کا سب سے بڑا محرک ہے، زبان کا اشتراک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں سب سے بڑا معاون ہے، جغرافی یک جائی دوسروں کے مقابل میں اپنے تحفظ اور مدافعت کا احساس پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر عامل ہے اور تہذیب و روایات کا اشتراک طرز فکر میں ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر ہے۔

جہاں اشتراک کے یہ تمام عوامل موجود ہوں وہاں اتحاد و ارتباط کا جذبہ اور حمیت و حمایت کا ولولہ پایا جانا ایک بالکل فطری چیز ہے۔ یہ جذبہ ارتباط و اتحاد پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کے مقابل میں اپنے ایک علیحدہ تشخص کا احساس اور تفوق و بالاتری کا ایک شعور بھی ابھارتا ہے، یہاں تک کہ جن لوگوں کے اندر اشتراک کے یہ سارے پہلو جمع ہو جاتے ہیں ان کے اندر نہایت پُرزور خواہش اس بات کی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے سارے معاملات خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنے تمام امر و نہی کے مالک وہ خود ہوں، کسی غیر کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ان کے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے۔

اس اشتراک کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ جہاں یہ پایا جائے وہاں سرے سے کوئی اختلاف یا تصادم واقع ہی نہ ہو۔ شخصی اور خاندانی اغراض و مصالح میں برابر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے لیکن ایک بالاتر اقتدار اس طرح کی ساری آویزشوں کو رفع کرتا رہتا ہے اور لوگ اس کے فیصلوں کے آگے

سرِ تسلیم خم کرتے رہتے ہیں۔ یہ سرِ تسلیم خم کرنا صرف اس وجہ سے نہیں ہوا کرتا کہ ایک قاہر اقتدار کے آگے کسی کے لیے دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑا دخل اس شعور کو بھی ہوتا ہے کہ قومیت کے بڑے فوائد سے متمتع ہوتے رہنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قومیت کا ہر جزو کسر و انکسار کے اصول پر اپنے بعض چھوٹے فوائد کو قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ اگر ہر شخص اپنے چھوٹے مفادات کی قربانی پر راضی نہ ہوگا تو بالآخر اسے بڑے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ شعور ایک خالص سیاسی شعور ہے اور درحقیقت یہی شعور ہے جو کسی قومیت کو ایک حقیقی وجودِ سیاسی کی حیثیت بخشتا ہے۔

قومیت کا نیا نظریہ دنیا میں ابتداء سے مذکورہ عوامل ہی قومیت کے اصلی عوامل کی حیثیت سے مسلّم مانے گئے ہیں اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ عوامل بالکل فطری اور قدرتی ہیں لیکن سائنس کی ترقیوں نے ان عوامل میں سے اکثر کو شہر بدر کر کے اب ساری اہمیت صرف جغرافی حدود یا دوسرے الفاظ میں وطن کو دے دی ہے۔ وطن کو ایک اہم عامل کی حیثیت تو ابتدا سے حاصل رہی ہے، لیکن اب تو اصلی عامل ہی یہی ہے۔ اگر اس عامل کے ساتھ دوسرے عوامل بھی موجود ہوں تو بہتر لیکن اگر یہ موجود ہے اور دوسرے عوامل موجود نہیں ہیں تو اسی کو اصل قرار دے کر دوسرے عوامل اب اسی سے مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وطن کے ایک فطری عامل قومیت ہونے سے تو، جیسا کہ عرض کیا گیا انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن جس نوعیت سے اب اس کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے وہ فطرت کے تقاضوں سے زیادہ ضرورت کی ایجاد ہے۔ سائنس کی ترقیوں نے اب قوموں میں تحفظ اور مدافعت کے احساس کو دوسرے تمام احساسات پر غالب کر دیا ہے اس وجہ سے قومیں اب جغرافی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی ہیں۔ اب نسل، زبان اور روایات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اہمیت دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور دوسرے قدرتی دفاعی حصارات کو دی جاتی ہے۔ پہلے قومیتیں عموماً زمین کے اتنے ہی خطہ پر قناعت کرتی تھیں جتنے کو وہ اپنی نسل، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کا گہوارہ سمجھتی تھیں، اس دائرے سے آگے بڑھنے کی خواہش صرف وہی قومیتیں کرتی تھیں جو غیر معمولی طور پر حوصلہ مند ہوتی تھیں اور جو دوسروں کو اپنا محکوم بنانے کا دم داعیہ رکھتی تھیں۔ لیکن اب ہر قومیت اپنے وطن کے حدود، اقتصادی

اور دفاعی نقطۂ نظر سے معین کرتی ہے اور اس پورے دائرے پر وہ بہرحال قابض رہنا چاہتی ہے اگرچہ خود اس کا اپنا وجود اس کے وطن کی قبا سے چھوٹا ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی قامت کے لحاظ سے اپنی قبا بنائے، کوشش یہ کرتی ہے کہ کھینچ تان کر کسی طرح اپنے وجود کو اس قبا کے مناسب بنا لے۔ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا واحد طریقہ جو وہ اختیار کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے وطن کے جو حدود وہ قرار دے لیتی ہے اس کے اندر جو دوسری قومیتیں ہوتی ہیں ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان قومیتوں کے اندر خود ان کی نسل، خود ان کی زبان، اور خود ان کے مذہب یا روایات کے لیے جو احساسات پائے جاتے ہیں ان کو وہ دباتی ہے اور وطنی قومیت کے نظریہ کے تحت خود اپنی زبان اپنے مذہب، اپنی روایات اور اپنے اشخاص و رجال کے عزت و احترام کو ان کے ذہنوں پر مسلط کرتی ہے تاکہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں غالب قومیت کے ہم رنگ ہو جائیں۔

مذکورہ عوامل کے نقائص مذکورہ عوامل کے معروف عوامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا، انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مجرد ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں چند خرابیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔

پہلی خرابی تو اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں اس کے زاویۂ نگاہ پر نسلی اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف ایک محدود حصہ ہوتا ہے اور اسی کو وہ پوری انسانیت سمجھتی ہے۔ اس کے لیے یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملہ پر، اس نقطۂ نگاہ سے غور کر سکے کہ یہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد، ایک ہی جسم کے اعضاء و جوارح، ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء و ارکان ہیں۔ ایک قلیل حصہ کے سوا ساری دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات ہمدردانہ و مشفقانہ ہونے کے بجائے یا تو رقیبانہ و حاسدانہ ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مصلحت پرستانہ۔ یہ حقیقت کے اعتبار سے اپنے ماسوا سب کی بدخواہ اور دشمن ہوتی ہے اور یہ بدخواہی و دشمنی اس کے دائرے میں عیب کے بجائے ہنر سمجھی جاتی ہے اور اس کو قوم پرستی کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ ان عوامل سے بنی ہوئی قومیتیں بالتدریج خود حق اور باطل کے لیے معیار کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کے اندر عصبیت کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ ان کے مخصوص تقاضوں

کی تحریک سے بالآخر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو یا باطل پر" اس حد تک پہنچ جانے کے بعد یہ قومیت ہی حق و باطل کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ جو چیز اس کے حق میں جاتی ہے وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے وہ باطل بن جاتی ہے۔ بڑے سے بڑا جھوٹ، بڑے سے بڑا ظلم اور بڑے سے بڑا فساد نیکی اور انصاف بن جاتا ہے اگر یہ کسوٹی اس کو نیکی اور انصاف قرار دیتی ہے۔ اور روشن سے روشن سچائی اور قطعی سے قطعی انصاف کی بات بھی غداری اور بغاوت ٹھیرا دی جاتی ہے اگر یہ کسوٹی اس کو غداری اور بغاوت ٹھیرا دے۔ اس طرح کی قومیت کے دائرے کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس کسوٹی سے بالاتر کسی اور معیار حق و باطل کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہہ سکے یا کوئی کام کر سکے۔ اگر وہ ایسی جرأت کرے تو عجیب نہیں کہ اس کو پھانسی کی سزا ملے اگرچہ وہ سقراط ہی کے درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ از خود پھیلنے اور دوسروں کو قائل کر کے ان کو جیت لینے کی فطری صلاحیت سے بالکل محروم ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو وہ اپنے خول کے اندر سمٹی سمٹائی پڑی رہے یا پھر جارحانہ عزم اور فاتحانہ حوصلہ کے ساتھ اٹھے اور جن پر اس کا زور چلے ان کو زیر نگین کر لے۔ ان دو صورتوں کے سوا اس کے لیے کوئی تیسری راہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے یہ یا تو دوسروں سے مار کھاتی ہے اگر اس کا مزاج منفعل اور شرمیلا ہوتا ہے یا دوسروں سے لڑتی بھڑتی رہتی ہے اگر اس کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس دلوں کو جیتنے اور عقلوں کو قائل کرنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ اس کے دائرے سے باہر ہیں وہ اس کی منطق اور حجت سے مفتوح ہو سکیں۔ یہ طاقت صرف نظریات اور اصولوں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو وہ دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو کر خود ان کے علم بردار اور ان کے پیش کرنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں لیکن نسل اور نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر آخر دوسری نسل والوں کے لیے کون سی کشش ہو سکتی ہے؟ دوسروں کے اندر اس کے لیے اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو تعصب کے جواب میں تعصب، احساس برتری کے جواب میں احساس برتری اور نفرت کے مقابل میں نفرت ہی ہو سکتی ہے۔ اصول اگر عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور تمام نسل انسانی، رنگ و خون اور زبان و

تہذیب کے سارے اختلافات کے علی الرغم ان کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتی ہے لیکن کسی خاص نسل کے دعوے داروں کے آگے از خود لوگ کیوں سپر انداز ہو جائیں؟ اپنے اس نقص کے سبب سے کسی نسلی قومیت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جہانی ریاست کی بنیاد رکھ سکے۔ اس طرح کی کسی قومیت نے اگر اپنی بلند حوصلگی کے سبب سے کبھی دنیا پر چھانے کی کوشش کی بھی ہے تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح چھائی ہے اور طوفان ہی کی طرح غائب بھی ہو گئی ہے۔ سکندر، نپولین، چنگیز اور تیمور کی فتوحات کی وسعت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جتنی تیزی کے ساتھ یہ آگے بڑھے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہ پیچھے بھی لوٹے ہیں۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ نسل کا اشتراک قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے کوئی بہت زیادہ قوی عامل نہیں ہے۔ یہ تعاون و ہمدردی اور حمیت و حمایت کا محرک اسی حد تک بنتا ہے، جس حد تک کسی نسل کے افراد میں ہم نسلی کی یادداشت تازہ ہو۔ یہ یادداشت چند پشتوں تک تو بلاشبہ باقی رہتی ہے لیکن اس سے آگے جا کر یہ اتنی مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اول تو کسی نسل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ اختلاط سے محفوظ ہے، یہ دعویٰ اگر کیا جا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ان قبائلی نسلوں ہی کی نسبت کیا جا سکتا ہے جن میں نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی ہے اور جو اپنے محدود سیاسی اغراض کے لیے اس نسلی رابطہ کے شعور کو اپنے افراد کے اندر تازہ رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہیں، دوسروں کے اندر اس کی حیثیت جیسا کہ عرض کیا گیا ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں ہوتی اس وجہ سے قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے اس کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور اس کے بل پر کوئی بہت مضبوط اور وسیع قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔

پانچویں خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس میں غلط غالب چونکہ نسل کا شعور ہی ہوتا ہے، زبان، تہذیب، روایات، ادب اور دوسرے عوامل سب پر اسی کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وجہ سے مذہب بھی اگر ان کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو وہ بھی انہی کا ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی نسلی قومیت کی مذکورہ خرابیوں کی کوئی اصلاح کرنے کے بجائے ان میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ ہماری مراد یہاں صرف انہی مذاہب سے نہیں ہے جو مشرکانہ

عقائد کے تحت انسانوں نے خود ایجاد کیے ہیں، یہ مذاہب تو ہوتے ہی قومی اور نسلی ہیں، بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح مذہب بھی نسلی عصبیت کے زیر سایہ ایک نسلی مذہب بن کے رہ جاتا ہے اور اپنی تمام عقلی اور فطری خوبیاں آہستہ آہستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال یہود کا مذہب ہے۔ بنی اسرائیل نے چونکہ کبھی اپنی نسلی قومیت کے خول سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے انھوں نے اپنے مذہب کو بھی، جو اصلاً ایک خدائی مذہب تھا تراش خراش کر اپنی قومیت ہی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ تورات میں یہ جو بار بار آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا" اور "اے اسرائیل تو خدا کا پہلوٹھا ہے" یہ سب اسی عصبیت نسلی کی پیدا کردہ تعبیریں ہیں۔ انھوں نے مذہب سے روشنی لینے اور اس روشنی سے اپنی نسلی عصبیت کی تنگ نظری دور کرنے کے بجائے اپنے مذہب کو بھی اپنی ہی طرح تنگ نظر اور متعصب بنا ڈالا اور یہ مذہب بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں کچھ معین ہوتا جو نسل و نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر مضمر ہیں الٹا ان خرابیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے میں ان کا ایک غیبی مددگار بن گیا۔

اس میں چھپی خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کے مطالبات اور فطرتِ سلیم اور عقلِ سلیم کے مقتضیات ایک خاص دائرہ ہی تک ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔ اس خاص دائرے سے آگے بڑھ کر عموماً ان کو ہم آہنگ رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دائرے سے آگے قومیت کے تقاضے صریحاً انسانیت کے وسیع مفادات، اخلاق کے معروف مسلّمات اور انصاف کے ہمہ گیر اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ قومیت کے علم بردار اس تصادم کو دور کرنے کے لیے قومیت کے مفاسد کا اعتراف کرنے کے بجائے کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ قومیت ہی کی اساس پر انسانیت، اخلاق اور انصاف کا ایک بالکل نرالا فلسفہ تیار کر دیں۔ یہ فلسفہ تیار تو ہو جاتا ہے، پڑھے لکھے ذہین لوگ اگر آمادہ ہو جائیں تو کیا نہیں کر سکتے؟ لیکن یہ فلسفہ سلیم الفطرت انسانوں کو کبھی اپیل نہیں کرتا۔ اس کے لیے مثال کے طور پر سولھویں صدی کے سیاسی فلسفی میکاویلی کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح کے فلسفے اہل سیاست کی امنگیں پوری کرنے کا وقتی طور پر ایک ذریعہ تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن انسان چونکہ ایک نسلی حیوان ہی نہیں بلکہ اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے اور اس کا یہ پہلو اس کے تمام دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے اس وجہ سے اندر سے طبیعتیں ان سے برابر ابا کرتی ہیں اور جس چیز پر کسی معاشرہ کے معقولیت پسند لوگ ہضم نہ ہوں اس کے بوتے پر کو کتنے دنوں تک چھپایا جا سکتا ہے؟ (باقی آئندہ)

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

چند تمہیدی باتیں

سفرِ حج کی چند ابتدائی قسطیں "المنبر" لائل پور میں نکل چکی تھیں اس وجہ سے میں نے "میثاق" میں ان کو شائع کرنا پسند نہیں کیا تھا لیکن بعد میں میثاق کے قارئین کا برابر یہ اصرار رہا کہ یہ قسطیں بھی میثاق میں شائع کی جائیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ میثاق کے پڑھنے والوں میں سے بہت تھوڑے افراد ہوں گے جنھوں نے المنبر کے صفحات میں اس سفرنامہ کو پڑھا ہوگا اس وجہ سے ان کے لیے یہ اشاعت بالکل بیچ سے شروع ہو گئی ہے۔ یہ دلیل خاصی وزنی ہے اس وجہ سے مجھے لوگوں کے اس تقاضے کا احترام کرنا پڑا، چنانچہ اس کی ابتدائی قسطیں بھی اب میثاق میں دی جا رہی ہیں۔

میرا یہ سفرنامہ صرف مشاہدات، تجربات اور تاثرات پر مبنی ہے۔ میں نے اس میں حج کی دعائیں اور اس کے احکام نہیں دیے ہیں۔ جب اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کی نوبت آئے تو مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے میری درخواست ہے کہ وہ اس کے ساتھ امام ابن تیمیہؒ کے رسالہ مناسک حج کا ترجمہ یا اس کا خلاصہ بطور ضمیمہ شامل کر دیں تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے بھی کارآمد ہو جائے جو سفرِ حج میں اس کو ساتھ رکھنا چاہیں۔

میں نے اس سفرنامہ میں جو کچھ لکھا ہے محض حافظہ کی مدد سے لکھا ہے اس وجہ سے واقعات کی ترتیب یا ناموں کے معاملہ میں ممکن ہے مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں۔ حکیم صاحب سارے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں اس وجہ سے امید ہے وہ ان کو درست کر لیں گے اور اگر وہ درست نہ کریں گے تو چونکہ ان غلطیوں میں میرے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اس وجہ سے

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے گا۔

میں نے اس سفرنامہ میں صرف انہی واقعات و حالات کا ذکر کیا ہے جن کا میرے دل پر کوئی نقش قائم رہ گیا تھا۔ میں نے وہ نقوش بے تکلف دل کے صفحہ سے اٹھا کر کاغذ کے صفحات پر رکھ دیئے ہیں۔ نہ کسی بات کے یاد کرنے کے لیے حافظہ پر زور ڈالا ہے نہ کہیں آرائش بیان کی کوشش کی ہے اور نہ کسی ایسی بات کو چھپانے ہی کی کوشش کی ہے، جو دل کے صفحہ پر موجود ہو۔

یہ سفرنامہ پڑھنے والوں کی نظر میں جیسا کچھ بھی ہو، میرے دل کا یہ بہرحال ایک عکس ہے۔ اگر یہ عکس اچھا ہے تو میری دعا ہے کہ دوسروں کے دل پر بھی یہ عکس پڑے اور اگر اس میں کوئی خرابی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بھی بچائے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھے۔

امین احسن اصلاحی

میں اپنے سفرِ حج کا کوئی سفرنامہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ سفرِ حج کے بہت سے سفرنامے پہلے سے مختلف لوگوں کے لکھے اور چھپے ہوئے موجود ہیں جو اس سفر سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر میں نے بھی کوئی سفرنامہ لکھ دیا تو اس سے لوگوں کو خاص فائدہ کیا پہنچے گا۔ چنانچہ کراچی میں جب میرے بھائی شیخ سلطان احمد صاحب نے ایک مجلس میں مجھ سے سوال کیا کہ "آپ اس سفر کا سفرنامہ تو لکھیں گے نا؟" میں نے جواب دیا کہ "نہیں، میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" انھوں نے سوال کیا کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ "شاید آپ ہی نے مجھے برنارڈشا کا ایک قول کبھی سنایا تھا جو مجھے بھولا نہیں ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ "جب تم کسی کی خود نوشت سوانحعمری پڑھو تو اس بات کو فراموش نہ کرو کہ بیان کرنے کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں اصل حقیقتیں ہوا کرتی ہیں۔" انھوں نے میرا یہ جواب سنا تو مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

برنارڈشا کے اس قول میں خود نوشت سوانحعمریوں پر گہرا طنز چھپا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ سفرنامے بھی کم و بیش انھیں کی صف میں آتے ہیں۔ لیکن اس قول کا حوالہ دینے سے میرا مقصد سفرناموں اور خود نوشت

سوانحعمریوں کی قدر و قیمت گھٹانا نہیں تھا۔ میں خود سفرنامے اور سوانحعمریاں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں اور ان میں سے بعض سے مجھے بڑا فائدہ بھی پہنچا ہے۔ میں درحقیقت اس قول کی آڑ لے کر اپنے آپ کو ایک سفرنامہ لکھنے کی ذمہ داری سے بچانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اس وقت دوستوں کے دباؤ میں آکر کوئی وعدہ کر بیٹھا اور پھر اس وعدہ کو پورا نہ کر سکا تو مجھے دوستوں سے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

علاوہ ازیں اس سفر کے لیے میں جب گھر سے نکلا تھا تو یہ ارادہ کر کے نکلا تھا کہ اپنے امکان کی حد تک اس کو اصل مقصد کے سوا ہر دوسری آلائش سے پاک رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں کے بعد کہیں ایک مرتبہ زندگی میں یہ موقع مل رہا تھا۔ معلوم نہیں پھر یہ سعادت نصیب ہو یا نہ ہو، اس وجہ سے میں نے چاہا کہ اصل نصب العین کے سوا کوئی اور چیز نگاہوں کے سامنے نہ آنے پائے۔

اگرچہ ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے کے ارادہ سے اس مقصد کی پاکیزگی میں کیوں خلل واقع ہونے لگا تھا؟ میں اس خیال کی تردید نہیں کرتا۔ اس طرح کے معاملات میں خیالات اور تجربات الگ الگ ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کی توجہ اس طرح کی چیزوں سے شاید منتشر نہیں ہوتی لیکن میرا حال اس معاملہ میں بالکل دوسرا ہے۔ میرا دل ڈرتا تھا کہ اگر میں اس سفر پر یہ خواہش ساتھ لے کر نکلوں گا کہ اس کی روداد دوسروں کو بھی سنانی ہے تو ممکن ہے حالات کے مشاہدہ میں میرا زاویۂ نگاہ بدل جائے۔ ایک سیاح جو سیاحت کے لیے نکلتا ہے اور ایک طالب جو کسی کی جستجو میں نکلتا ہے۔ دونوں حالات کو ایک ہی زاویہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک حالات کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ ان کو ایک داستان کی صورت میں لا کر دوسروں کو بھی سنا سکے اور صرف سنا ہی نہ سکے بلکہ لوگوں کو محظوظ بھی کر سکے، یہ ضرورت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ داستان کے جس حصہ میں کوئی خلا محسوس کرے وہاں زیبِ داستان کے لیے اپنی طرف سے اضافے کرے تاکہ اس کے سامعین کی دلچسپی قائم رہ سکے۔ برعکس اس کے ایک طالب کا معاملہ صرف اس کے اور اس کے مطلوب کے درمیان ہوتا ہے، اس میں کوئی تیسرا شریک نہیں ہوتا، اس وجہ سے جو چیز اس کے سامنے جس شکل میں آتی ہے اسی شکل میں وہ اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ اس کو پسند آئے یا نہ آئے۔

بہرحال میرا بالکل ارادہ نہ تھا کہ میں کوئی سفرنامہ لکھوں گا۔ اسی خیال کے تحت میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ حتی الامکان لوگوں سے ملنے جلنے سے بھی احتراز کرنا ہے، کم از کم

یہ کہ اس کے لیے خود اپنی طرف سے کوئی پہل نہیں کرنی ہے۔ یہ بات میں نے اپنے رفیقِ سفر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ایڈیٹر المنبر (لائل پور) پر جہاز کے عرشہ پر قدم رکھتے ہی ظاہر بھی کردی تھی۔ لیکن حرمین شریفین میں کم و بیش دو ماہ کے قیام کے دوران میں جو حالات میرے تجربہ اور مشاہدہ میں آئے، وہ مجھے برابر اس بات پر اکساتے رہے کہ میں اپنے اس فیصلہ میں تبدیلی کر دوں۔

اس تبدیلی کے بعض محرکات کا ذکر میں یہاں مناسب خیال کرتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس تبدیلی کے لیے ترغیب دی وہ یہ ہے کہ مجھے بہت سے ایسے نوجوان اور نئے تعلیم یافتہ لوگ ملے جن کے ذہنوں میں سفرِ حج کے ہر مرحلہ اور اس کے اکثر مناسک سے متعلق طرح طرح کے سوالات موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی فطری دینداری یا ان کی خاندانی روایات کے اثر نے ان سوالات کو اعتراضات کی شکل اختیار کرنے نہیں دی ہے، وہ حج کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ایک بہت بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسی عقیدہ کے تحت وہ دور دراز سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے بھی تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہنوں کے اندر ایک قسم کی خلش اور بے چینی موجود ہے، اور اس بے چینی میں ان مشاہدات نے بھی بہت کچھ اضافہ کیا ہے جن سے حج کے مختلف مراحل میں وہ گذرے ہیں۔ نیز میں نے محسوس کیا کہ حج سے متعلق اس دوران میں جو لٹریچر انھوں نے پڑھا ہے اس سے ان کے ذہن کی الجھنیں دور نہیں ہوئی ہیں اور وہ اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ حج پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس سے ان کی یہ الجھنیں دور ہوں۔ ان میں سے اکثر نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ یہ خدمت میں انجام دوں۔ اگر ایک مستقل کتاب لکھنا فی الحال ممکن نہ ہو تو ایک سفرنامہ ہی کی شکل میں سہی۔

دوسری چیز جس نے مجھے اس تبدیلی کی ضرورت محسوس کرائی وہ یہ ہے کہ اس سفر کے ہر مرحلہ میں میں نے یہ تجربہ کیا کہ سائنس کی ترقیوں نے اس زمانہ میں اگرچہ اس جاں گسل سفر کی صعوبتیں بہت بڑی حد تک کم کر دی ہیں لیکن دوسری طرف مختلف حکومتوں نے طرح طرح کی بے ضرورت قیدیں اور فضول قسم کی دفتری پابندیاں بڑھا کر ان میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور اس سے کہیں زیادہ اضافہ عوام کی بے خبریوں اور ان کی نادانیوں سے ان میں ہو رہا ہے لیکن ان کی اصلاح کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں ہے۔ میں نے خیال کیا کہ سفرنامہ سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو قابلِ اصلاح چیزوں کی طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے۔

تیسری چیز وہ جدید رجحانات ہیں جو حجاز میں اس وقت بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں اور جو حکومت سعودیہ کے لیے بھی قابلِ غور ہیں اور خود ہمارے لیے بھی قابلِ غور ہیں۔ اگر ان رجحانات کو اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو اچھی طرح نہ سمجھا گیا اور جلدی نہ سمجھا گیا تو اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ حجاز ہمارا مرکزِ روحانی ہونے کے سبب سے پورے عالمِ اسلامی کے جسد کے اندر دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بیماری پورے عالمِ اسلامی کی بیماری اور اس کی صحت پورے عالمِ اسلامی کی صحت کے ہم معنی ہے۔ آج جس طرح لاکھوں حاجی وہاں سے حج کی برکتیں لے کر لوٹتے ہیں، اسی طرح اگر وہاں خرابیاں پیدا ہو جائیں تو ان میں بھی لازماً ہمارا حصہ ہوگا اور ہم ان سے کسی حال میں بھی اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گے۔

ان محرکات نے مجھے یہ سفرنامہ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مقاصد اس سے پورے ہوں جن کے لیے میں نے یہ زحمت اٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔

ارادۂ حج

مجھے حج کا شوق بلکہ اس کے لیے اضطراب ایک مدت سے تھا اور عمر جوں جوں گذرتی جاتی تھی یہ اضطراب برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس اضطراب کی تخم ریزی میرے دل میں سب سے پہلے میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر سے ہوئی۔ انھوں نے آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ[1] (۹۷ آل عمران) پر دورانِ درس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حج سے بے پروا ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی ہو کے مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ مولانا کی یہ تقریر آیت کے الفاظ سے اس قدر لگتی ہوئی تھی کہ بات فوراً ہی میرے دل میں اتر گئی۔ لیکن خود بات اس قدر سخت اور دل کو ہلا دینے والی تھی کہ میں اس کو سن کر کانپ گیا۔ مولانا کی اس تقریر کے بعد میں نے خود اس مسئلہ پر بار بار غور کیا اور جتنا ہی غور کرتا گیا اتنی ہی اس کی حقیقتیں مجھ پر واضح ہوتی گئیں لیکن اس بات کی سختی کے سبب سے میرا دل ایک عرصہ تک یہی چاہتا رہا کہ میں اس کو مولانا کے ایک تفسیری نکتہ سے زیادہ اہمیت نہ دوں۔ لیکن جب مزید مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مولانا کا کوئی

[1] اور لوگوں پر اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج کرنا ہے، جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو اور جس نے کفر کیا تو اللہ دنیا والوں سے بے پروا ہے۔

اپنا تفسیری نکتہ نہیں ہے، بلکہ حدیث صحیح سے بھی ان کے بیان کی تائید ہوتی ہے تو پھر اس کو ایک قطعی اور واضح حقیقت تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہا۔ اب اگر کوئی چیز میری ڈھارس بندھانے والی باقی رہ گئی تو وہ صرف یہ تھی کہ میں صاحبِ استطاعت نہیں تھا۔

یہ حج کے لیے میرے اضطراب کا آغاز تھا اور اس اضطراب کی تہہ میں جیسا کہ واضح ہوا یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ حج سے بے پروا ہو کر زندگی گذارنے والا شخص ایمان پر مرنے کی توفیق ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔

بعد میں اس خوف پر شوق کا اضافہ بھی ہوا اور وہ بھی مولانا مرحوم ہی کی بعض کتابوں سے ہوا۔ میں نے جب مولانا کی تفسیر سورۂ کوثر کا مطالعہ کیا تو اس سے بیت اللہ کی روحانیت کی تصویر میرے سامنے آئی اور یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خانہ کعبہ دنیا میں حوضِ کوثر کا مجاز ہے، جو شخص دنیا میں اس کوثر پر نہیں پہنچے گا وہ آخرت کے حوضِ کوثر کی برکتوں سے محروم رہ جائے گا۔ اسی طرح مولانا کی تفسیر سورہ فیل اور ان کے رسالہ ذبیح کے مطالعہ سے مجھ پر قربانی، طواف، حجرِ اسود، رمی جمرات اور دوسرے مناسک کے اسرار کے بعض گوشے بے نقاب ہوئے اور ایسے موثر انداز میں بے نقاب ہوئے کہ میرے دل میں گھر کر گئے۔

یہ خوف اور شوق دونوں چیزیں میرے دل میں عین عنفوانِ شباب میں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد سے مجھے حج کے لیے جانے والوں پر رشک آنے لگا۔ جب حج کا زمانہ آتا میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی، کہ کاش میرے لیے بھی وہ دن آئے کہ میں احرام باندھے ہوئے ننگے سر لبیک اللّٰھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک کہتا ہوا جدہ کے ساحل پر اتروں، بیت اللہ کا طواف کروں۔ یمین اللہ (حجر اسود) کو بوسہ دے کر از سرِ نو اپنے رب کے ساتھ بندگی کا عہد باندھوں، مقامِ ابراہیم اور حطیم میں نمازیں پڑھوں، عرفات اور مزدلفہ میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں، منیٰ میں قربانی کروں اور اپنی غلامی کے اعتراف کے لیے سر منڈاؤں اور صفا و مروہ کی سعی کی سعادت حاصل کروں۔

سال کے بعد سال بیتتے گئے اور زندگی کے دن ان ہی حسرتوں میں گذرتے رہے۔ جب تک جوانی کا دم باقی رہا گناہوں کا بوجھ بھاری ہونے کے باوجود نہایت ہلکا پھلکا محسوس ہوتا رہا اور اس کی گرانباری سے پست ہمت ہونے کے بجائے دل یہی چاہتا رہا کہ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ یہ احساس بھی پیدا ہونا شروع ہوا کہ یہ بوجھ طاقت سے زیادہ ہے بلکہ کبھی کبھی اس گرانباری کا احساس اس

شدت کے ساتھ ہونے لگا کہ معلوم ہوتا کہ کمر ٹوٹی جا رہی ہے اور دل بیٹھا جا رہا ہے۔ آخر اس بوجھ سے رہائی پانے کی کوئی تدبیر بھی ہے؟ یہ سوال طبیعت میں بار بار پیدا ہونے لگا اور اس شدت و قوت کے ساتھ پیدا ہونے لگا کہ دل و دماغ کے ہر گوشہ پر چھا گیا۔

اسی دوران میں ایک حدیث نگاہ سے گذری جس میں بیان ہوا ہے کہ تین کام ایسے ہیں جو آدمی کے تمام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایک کفر سے نکل کر اسلام میں آنا، دوسرا خدا کی راہ میں ہجرت کرنا، تیسرا حج کرنا۔ یہ حدیث نگاہوں سے گذری تو بار بار ہوگی، پڑھی بھی ہوگی اور پڑھائی بھی ہوگی، لیکن کسی چیز کی حقیقی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کی ضرورت نہ ہو۔ اس زمانہ میں اس حدیث کا میں بہت محتاج تھا بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بیجا نہ ہو کہ اب اس قسم کے کسی سہارے کے بغیر مجھے زندگی بالکل وبال معلوم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ جب یہ حدیث میری نظر سے گذری تو میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے اس سے کتنی خوشی ہوئی۔ مجھے سکون و راحت اور اطمینان و تسلی کا ایک خزانہ مل گیا۔ میں نے اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے گناہگار بندوں کی مغفرت کے لیے ایک ایسی راہ بھی کھولی ہے جس پر مجھ جیسے کم ہمت بھی چل سکتے ہیں۔

جہاں تک کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہونے کا تعلق ہے، یہ اتنا بڑا معرکہ ہے کہ اس کو سر کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے ایک مسلمان گھرانے میں اسلام پر پیدا کیا، اسلام میں داخل ہونے کا معاملہ اگر اپنی ہی کوشش اور اپنے ہی اجتہاد پر منحصر ہوتا تو معلوم نہیں کیا بنتا۔ اسی طرح ہجرت کی راہ بھی کوئی آسان راہ نہیں ہے، بڑے ہی جانباز اور بڑے ہی صاحبِ عزم تھے وہ لوگ جنھوں نے خدا کے لیے ہر چیز کو چھوڑ دیا۔ اگر ہم کو یہ بازی کھیلنی پڑے تو نہیں معلوم بڑے بڑے مدعیانِ استقامت و عزیمت کی صفوں میں سے بھی کوئی اس کا اہل نکل سکے یا نہ نکل سکے؟ البتہ حج ایک ایسی چیز ضرور ہے جس کی ہمت ہم جیسے کمزور اور پست ہمت بھی کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس سے زندگی بھر کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ رب کریم نے اپنی کریمی کے لیے اس کو ایک بہانہ بنایا ہے۔

بہرحال حج کے معاملہ میں اس مقام تک میں ایک عرصہ سے پہنچا ہوا تھا، بلکہ اگر دل کی کیفیات کوئی قابل لحاظ چیز ہوں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ادھر پچھلے کئی سال سے میرا دل حج ہی میں رہا ہے۔ لیکن اس شوق و اضطراب کے باوجود بعض ناقابل ذکر مجبوریاں ایسی سدِ راہ تھیں کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ کبھی میری یہ آرزو

پوری ہو سکے گی لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی بات کو چاہتا ہے تو غیب سے اس کے محرکات و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ میں ادھر کچھ عرصہ سے اپنے گرد و پیش سے کچھ ایسا دل شکستہ ہو رہا تھا کہ دل بار بار یہ چاہتا تھا کہ اس ماحول کو چھوڑ کر کم از کم کچھ ہی دنوں کے لیے کہیں چلا جاؤں۔ اس مقصد کے لیے بہترین جگہ جس کا میں انتخاب کر سکتا تھا، وہ خدا کا گھر ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کا سامان کر دیا۔ اور اپنی جس دیرینہ تمنا کے پوری ہونے کی توقع میں نہیں کرتا تھا وہ تمنا خدا نے پوری کر دی۔

اس دوران میں اپنے رب کی عنایات کے جو کرشمے میں نے دیکھے ہیں، نہ میں ان کا اندازہ کر سکتا تھا اور نہ ان کو بیان کر سکتا ہوں۔ یہ سفر نامہ میں سر دھانا جہاز میں، سفر حج سے واپس ہوتے ہوئے اپنے کیبن کے سامنے بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ سامنے پھیلا ہوا سمندر ہے اور اس میں آج کسی قدر تلاطم ہے۔ لیکن اس سے زیادہ تلاطم میرے دل میں اس خوشی نے پیدا کر رکھا ہے کہ مجھ جیسے گنہگار بندے کو اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق بخشی اور میں اب اس فریضہ سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کو لوٹ رہا ہوں۔ جہاز کے ایک افسر نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے کہ اب ہمارے سفر کا زیادہ حصہ طے ہو چکا ہے اور اب ہم کراچی سے بہت قریب ہیں۔

چاٹگام میں میثاق کے ملنے کا پتہ

مقصود اعظمی صاحب، شبلی اکاڈمی۔ اسلام آباد چاٹگام

ڈھاکہ میں میثاق کے ملنے کا پتہ

جناب یوسف ریاض صاحب

۱۷۔ بھاگل پور لین۔ ڈھاکہ ۱

☆

اقتباسات و تراجم

جناب خالد مسعود صاحب، ایم ایس سی

عصمت فروشی پر اقوام متحدہ کی رپورٹ

ایک مطالعہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی تھی جس کا منشا یہ تھا کہ بردہ فروشی اور عصمت فروشی کے جرائم انسان کی شرافت و نجابت کے بالکل منافی ہیں۔ ان سے انسانی معاشرہ کو پاک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ جنرل اسمبلی نے ان مفاسد کی روک تھام کے لیے متعدد سفارشات پیش کیں، جنھیں اب تک ۲۶ مملکتوں نے منظور کر لیا ہے۔ انہی سفارشات کی روشنی میں اقوام متحدہ کی سماجی کونسل کے مقرر کردہ ایک کمیشن نے ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحث بھی کی اور بردہ فروشی و عصمت فروشی کے انسداد کے لیے ایک لائحہ عمل بھی تجویز کیا۔ اقوام متحدہ کے اقتصادی و سماجی امور کے شعبہ نے اس رپورٹ کو STUDY ON TRAFFIC IN PERSONS & PROSTITUTION کے نام سے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ رپورٹ ایک با اثر عالمی ادارہ نے مرتب کی ہے اور ایک ایسے مسئلہ سے متعلق ہے جس سے دنیا کے تقریباً سبھی ممالک دوچار ہیں، اس لیے اس رپورٹ کے مندرجات خاص اہمیت کے حامل ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے اس مسئلہ کے بارے میں عالمی رجحانات کا جائزہ لیا جائے۔

رپورٹ کے پہلے باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بردہ فروشی و عصمت فروشی کے اہم مسائل عالمی سطح پر یہ پہلی ہی بار زیر بحث نہیں آئے بلکہ عالمی کمیٹیاں نصف صدی سے ان کے تدارک کے لیے تجاویز پیش کر رہی ہیں۔ کمیشن کے پیش کردہ جائزہ کے مطابق سر بازار مسئلہ کا کوئی موثر پہلو چھوٹ جانے کی وجہ سے ان کمیٹیوں کی سفارشات متوقع نتائج حاصل نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۷ء کے ایک عالمی

کنونشن نے نابالغ بچیوں کی عام خرید و فروخت اور بالغ عورتوں کی بجبر خرید و فروخت کو روکنے کی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں دوسرے کنونشن نے عمر کی قید لگائی اور یہ فیصلہ کیا کہ بیس سال سے زیادہ عمر کی عورتوں کی تجارت اس وقت جرم قرار دی جائے جب وہ بجبر و اکراہ کی جائے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں عمر کی یہ مقدار بڑھا دی گئی۔ لیکن مسئلہ جوں کا توں باقی رہا۔ بالآخر سنہ ۱۹۳۳ء میں ہر عمر کی عورتوں کی تجارت ممنوع قرار دینے کی سفارش کی گئی، خواہ وہ بجبر ہو یا برضا و رغبت۔ چونکہ اس طرح کی سفارشات سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا اس لیے مجلس اقوام (LEAGUE OF NATIONS) نے سنہ ۱۹۳۷ء میں ان تمام کوششوں کا از سر نو جائزہ لیا اور زیادہ مؤثر پروگرام بنانے کا فیصلہ کیا۔ اقوام متحدہ کی موجودہ کوشش بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ زیر نظر رپورٹ کی اس تاریخ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کتنا ہی عقل مند، دور اندیش اور عقلیت پرست سہی لیکن اس کی نظر چونکہ محدود ہے اس وجہ سے کسی مسئلہ کے سارے پہلوؤں کا وہ بیک وقت استقصا نہیں کر سکتا۔ عقل محض پر کلی اعتماد کا یہ ایک ایسا سقم ہے جس سے مفر نہیں۔ انسان اگر اس خرابی سے محفوظ رہ سکتا ہے تو صرف ایک ہی طریقہ سے محفوظ رہ سکتا ہے وہ یہ کہ خدا کی شریعت پر اعتماد کرے اور اپنی باگ اس کے حوالہ کر دے۔

گذشتہ کوششوں کو دیکھتے ہوئے زیر نظر رپورٹ سے زیادہ سے زیادہ جو توقع وابستہ کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں زیر بحث مسئلہ کا نسبتاً زیادہ حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہوگا اور پچھلی سفارشات کی خامیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہوگی۔

رپورٹ کا مطالعہ کرتے وقت اس کی جو نمایاں خصوصیت ایک قاری کو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ نفس مسئلہ کے وہ سارے پہلو اس میں زیر بحث آ گئے ہیں جن کا اس مسئلہ سے کسی نوعیت کا تعلق ہے یا جو اس کے تدارک کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ رپورٹ میں بین الاقوامی بردہ فروشوں کی سرگرمیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، عصمت فروشی کے اسباب و عوامل بھی زیر بحث آئے ہیں، عصمت فروشی کے انسداد کی قانونی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جنسی بیماریوں کے پھیلانے میں طوائفوں کا جتنا حصہ ہے اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، پھر انسداد عصمت فروشی کی اولین شرائط (PREREQUISITES) ... اس کے لائحہ عمل اور طوائفوں کی آباد کاری کے لیے متعدد مفید تجاویز بھی

پیش کی گئی ہیں۔ ایک بڑی خوش آیند اور حقیقت پسندانہ بات کمیشن کا یہ احساس ہے کہ سوسائٹی میں عصمت فروشی کا رواج انسانیت کے دامن پر ایک مکروہ دھبہ ہے اور یہ کہ سرسری قسم کی قانون سازی اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں، بلکہ معاشرہ کو اس بیماری سے اگر نجات دینی ہے تو اس کے سرچشموں کو بند کرنا ناگزیر ہے۔ اس کا مقابلہ ایک وسیع تر پروگرام سے ہونا چاہیے اور اس کے انسداد کے فطری نتائج سے دوچار ہونے کی ہمت بھی پیدا کی جانی چاہیے چنانچہ کمیشن نے لکھا ہے:—

"یہ متفقہ قرارداد اعلان کرتی ہے کہ عصمت فروشی اور اس کے ساتھ بردہ فروشی کی لازمی برائی انسان کی عظمت سے کوئی جوڑ نہیں رکھتی۔ یہ برائیاں فرد، خاندان اور قوم سبھی کی بہبود کو خطرہ میں ڈال دیتی ہیں۔"

"اجازت یافتہ عصمت فروشی کا انسداد بردہ فروشی کو ختم کرنے کے پروگرام کی شرط اولین ہے۔ بذات خود یہ قدم اٹھا کر کامیاب نتائج ہرگز حاصل نہ ہو سکیں گے۔ اس لیے لازمی امر ہے کہ اس کے ساتھ بیک وقت دوسرے اقدامات بھی کیے جائیں جن کا مقصد عوام کا نظم و ضبط قائم رکھنا، جنسی بیماریوں کا تدارک، دلالی کی بیخ کنی، بھڑواپن کا انسداد اور طوائفوں کی آباد کاری ہو۔"

اسی طرح کا حقیقت پسندانہ مطالعہ عصمت فروشی کی وجوہات بتاتے وقت پیش کیا گیا ہے۔ کمیشن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:—

"معاشرہ کی کسی وبا کی بیخ کنی کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کو دور کیا جائے جہاں تک عصمت فروشی کا تعلق ہے، یہ کسی ایک سبب کے نتیجہ میں وجود پذیر نہیں ہوتی بلکہ عموماً مختلف اسباب و عوامل کے مجموعی اثر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان عوامل کی بالکل فطری تقسیم دو قسموں میں ہوتی ہے۔ پہلے وہ عوامل جو طوائفوں کی رسد (SUPPLY) میں مدد یا اس پر منتج ہوتے ہیں، دوسرے وہ عوامل جو عصمت فروشی کی مانگ پیدا کرتے یا بڑھاتے ہیں۔ اس لیے انسدادی تدابیر کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلب و رسد دونوں کو کم کریں۔"

رپورٹ کا یہ مطالعہ اس قدر اطمینان بخش ہے کہ کوئی شخص اس سے اختلاف نہیں کرے گا۔ معاشرے

کی کسی بیماری کا علاج فی الواقع اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی طلب و رسد دونوں کو ختم کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔ اگر طلب باقی رہنے دی جائے، صرف رسد پر پابندی عائد کی جائے، تو ممکن ہے وہ مسئلہ اپنی خاص ہیئت میں برقرار نہ رہے یا نسبتاً کم ہو جائے، لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ مسئلہ کوئی دوسری شکلیں نہ اختیار کرے گا۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے اور اس قسم کے ردِ عمل کا ثبوت خود اسی رپورٹ ہی سے ملتا ہے۔ کمیشن نے لکھا ہے کہ مجلس اقوام کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بردہ فروشی و عصمت فروشی کے جو اعداد و شمار جمع کیے تھے، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ناجائز کاروبار بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے لیکن حال ہی میں یو این او کے سیکرٹریٹ کے سوالنامے کے جو جوابات مختلف حکومتوں کی طرف سے وصول ہوئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر یہ کاروبار پہلے سے بہت کم ہو گیا ہے۔ اس کمی پر تبصرہ کرتے ہوئے کمیشن نے لکھا ہے:-

"لیکن اس کمی سے ہرگز یہ نہ فرض کر لیا جائے کہ بین الاقوامی سطح پر یہ کاروبار اب کوئی دردِ سر نہیں رہا ہے یا یہ کہ قومی یا بین الاقوامی سطح پر اختیار کردہ تدابیر اس کی بیخ کنی کے لیے کافی ہیں۔ یہ حقیقت نظر میں رہنی چاہیے کہ حکومتیں جو اطلاعات دیا کرتی ہیں وہ ان اعداد و شمار کے مطابق ہوتی ہیں جو حکومت کے علم میں لائے جاتے ہیں۔ ان سے جرائم کی واقعی تعداد کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں، قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے بردہ فروش اپنی ناجائز سرگرمیوں کو اب قانونی شکلیں دینے لگ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ان کی شکل میں جرم پر آسانی سے گرفت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا اندازہ شماریات سے کیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر حکومت آسٹریا نے اطلاع دی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے نوجوان مغنیوں اور گانے والیوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے دلال کثیر تعداد میں مغنیوں کے گروہ تیار کرنے اور دوسرے ملکوں کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ جس وقت یہ گروہ تیار کیے جاتے ہیں، درخواست دہندہ لڑکیوں کی فنی مہارت کی بجائے ان کی شکل و شباہت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ان لڑکیوں سے جو معاہدہ کیا جاتا ہے اس میں بڑی چالاکی سے ایسی دفعات شامل کر دی جاتی ہیں جن کے نتیجہ میں انھیں عصمت فروشی کی طرف بآسانی دھکیلا جا سکے۔"

فرانس اور لکسمبرگ کی حکومتوں کی جو اطلاعات رپورٹ میں درج ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں نے قانون سے بچنے کے لیے اسی طرح کی بظاہر معصوم شکلیں اختیار کر کے اپنا کاروبار جاری رکھا ہے۔ عصمت فروشی کے انسداد کے لیے بھی اگر کوئی صحیح لائحہ عمل ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ اس کی مانگ کو ختم کرنے کی سعی بھی پروگرام کا لازمی جزو ہو، جیسا کہ رپورٹ تجویز کرتی ہے۔

عصمت فروشی کی طلب کو زیر بحث لاتے ہوئے کمیشن نے امریکہ میں مرتب شدہ کنسے[1] رپورٹ کا ایک عبرت ناک حوالہ دیا ہے۔ اس حوالہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان "ترقی یافتہ اور مہذب" ممالک میں جنسی اختلاط کا جو طوفان اٹھ رہا ہے، وہ کس قدر شدید ہے اور اس کے اثرات نے قوم کی قوم کو کس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی ممالک "غیر مہذب" ہونے کے باوجود کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس طوفان سے ابھی بہت بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ کنسے رپورٹ بیان کرتی ہے کہ:-

"کل سفید فام مرد آبادی میں سے تقریباً ۶۹ فیصد کو طوائفوں کے ساتھ تجربہ ہو چکا ہے..... پچیس سال کی عمر کو پہنچنے تک مڈل سکول تک پڑھے ہوئے ۸۴ فیصد، ہائی اسکول تک پڑھے لکھے ۵۴ فیصد اور کالج کے تعلیم یافتہ ۲۸ فیصد نوجوانوں کے طوائفوں کے ساتھ تعلقات قائم رہ چکے ہیں۔"

کمیشن نے نفسیاتی تحقیقات کے حوالہ سے بتایا ہے کہ طوائفوں کے پاس جانے والے لوگ ذہنی اعتبار سے نارمل حالت میں نہیں ہوتے، ان میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی بے قاعدگی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا انکشاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ۶۹ فی صد مرد نفسیاتی بے قاعدگیوں کا شکار اور صرف ۳۱ فیصد متوازن ذہن رکھنے والے ہیں؟ ذہنی و اخلاقی توازن کا یہ فقدان کیا مغربی تہذیب کا خاصہ ہے؟ اگر امریکہ جیسے مغربی تہذیب کے علمبردار ملک کی حالت یہی ہے تو دوسرے یورپی ممالک جیسی کمال تک پہنچ چکے ہوں گے، اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

کمیشن کی تحقیق یہ ہے کہ بیسواؤں کے پاس جانے والے لوگ یا تو غیر شادی شدہ ہوتے ہیں یا وہ لوگ جو ذہنی اعتبار سے کچھ بے قاعدہ ہوتے ہیں۔ چونکہ عصمت فروشی کی مانگ انہی لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے کمیشن نے اس مانگ کو ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی ہیں:

(۱) وسیع پیمانے پر نفسیاتی علاج کا پروگرام جس میں جنسی تعلیم لازمی ہو،

[1] KINSEY ETAL, 'SEXUAL BEHAVIOUR IN THE HUMAN MALE' ـــه

(ب) عصمت فروشی کے خلاف عوامی رائے ابھارنے کی کوشش،

(ج) شادی کی حوصلہ افزائی اور کنبہ وخاندان کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش،

(د) عصمت فروشی کو فروغ دینے والی چیزوں مثلاً ہر قسم کی بداخلاقی، نشہ آور چیزوں کے استعمال، فحش لٹریچر کی اشاعت وغیرہ پر پابندی،

(ہ) فرصت کے لمحات کو گذارنے کے لیے تفریحی مراکز کا قیام، وغیرہ۔

جہاں تک شادی کی ہمت افزائی، عائلی نظام کی مضبوط بنیادوں پر تشکیل اور بداخلاقی پر ابھارنے کے اسباب پر پابندی کا تعلق ہے، ان کے مفید و موثر ہونے میں کسی کو کلام نہ ہوگا۔ فی الواقع ان چیزوں کا فقدان ہر قسم کے اخلاقی مفاسد کے دروازے کھول دیتا ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ایسی بیماری کا علاج جو فرد سے کم اور معاشرہ کی اٹھان سے زیادہ تعلق رکھتی ہو، جو پروپیگنڈہ کی بجائے غلط اخلاقی اقدار کے اپنانے سے پیدا ہوئی ہو، جو دماغ سے زیادہ قلب و روح پر اپنا اثر رکھنے والی ہو، دماغی و نفسیاتی ہسپتالوں، تفریح کے مراکز اور پروپیگنڈہ کی مشینری کے استعمال سے کیسے ہو سکتا ہے؟ رپورٹ اس پہلو سے کوئی روشنی نہیں دیتی۔

طوائفوں کی رسد (SUPPLY) کے بارے میں بھی کمیشن نے اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں انفرادی اسباب گناتے ہوئے بیسواؤں کے غیر متوازن ذہن ہی کو زیادہ اہمیت دی ہے اور تجویز کیا ہے کہ عورتوں کے لیے ایسے مراکز کھولے جائیں، جہاں ان کے نفسیاتی علاج اور جنسی تعلیم کا انتظام ہو۔

کمیشن نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ آزادانہ صنفی اختلاط بالعموم عصمت فروشی پر منتج ہوتا ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس مشاہدہ سے یہ منطقی نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے کہ آزادانہ صنفی اختلاط کو ختم کیا جانا چاہیے اور عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار الگ الگ رکھنے چاہئیں، تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ اس طرح ملنے والے لوگوں کا وقتاً فوقتاً نفسیاتی معائنہ کیا جانا چاہیے تاکہ ان کے جنسی رجحانات اگر بے قابو ہو رہے ہوں تو انھیں معتدل کیا جائے۔ یعنی یہ کہ شہر میں گندے جوہڑ تو بدستور رکھے جائیں البتہ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مچھر ان سے ملیریا کے جراثیم نہ لینے جائیں۔ یا للعجب!

عصمت فروشی کے اجتماعی عوامل کے تعین کے بارے میں رپورٹ کسی نتیجے تک نہیں [illegible] اتی۔ روس اور چیکوسلاواکیہ کی حکومتوں کی اطلاعات کے مطابق وہاں جب عورتوں کو ملازمتیں مہیا کی گئیں اور

ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تو عصمت فروشی بالکل ختم ہو گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتر معاشی حالات عورتوں کو اس لعنت کے اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور اگر ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے تو اس وبا کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جب برطانیہ و امریکہ کی صورتِ حال کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں دولت کی فراوانی اور عورتوں اور مردوں کے حقوق کی یکسانیت کے باوجود مسئلہ بدستور باقی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں برطانیہ میں ایک کمیٹی ملک میں عصمت فروشی کی صورتِ حال پر اپنی رپورٹ دینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس نے یہ تبصرہ کیا کہ "ان دنوں برطانیہ میں عصمت فروشی کے عوامل میں معاشی عوامل ہرگز نمایاں حیثیت نہیں رکھتے"۔ اسی طرح رپورٹ نے کثرتِ شراب نوشی کو بھی عصمت فروشی کے اسباب میں شمار کیا ہے۔

ان مختلف رایوں کے نتیجہ میں کمیشن یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ عصمت فروشی کے عوامل میں بنیادی اہمیت کس چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے تجویز کیا ہے کہ تمام ملکوں میں ایسی کمیٹیاں تشکیل کی جائیں جو ان عوامل کو خود متعین کریں اور ان سے نبرد آزما ہونے کی ترکیب بتائیں۔ لیکن اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کمیشن خود وہ اسباب ہی متعین نہیں کر سکا جو زیر بحث مسئلہ کے پیدا ہونے کا باعث ہیں تو اس کے انسداد کی تجاویز دینے کا اہل وہ کیسے ہوگا؟ اور اس کا پیش کردہ لائحہ عمل کس حد تک مفید ہو سکتا ہے؟ اصل اسباب کے تعین میں ناکام ہو کر (اور ناکامی کا اظہار کرکے) اپنی سفارشات پیش کرنا کچھ انوکھی سی بات ہے۔

اب آئیے دیکھیں، ان سفارشات سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ لائحہ عمل کے باب میں عصمت فروشی کو بنیادی طور پر ایک سماجی، سیاسی و اقتصادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹ کی تجویز یہ ہے کہ اس کا مقابلہ انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد چکلوں کے انسداد پر زور دیا گیا ہے:

"جہاں کہیں باقاعدہ چکلوں کی اجازت دی گئی ہے، اس اجازت کو فی الفور ختم کر دیا جانا چاہیے۔ عصمت فروشی کے باقاعدہ اڈوں کی قانونی اجازت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ از روئے قانون عصمت فروشی وبردہ فروشی کی ایک منڈی ہاتھ آجاتی ہے... اس لیے حکومتوں کو چاہیے کہ وہ عصمت فروشی کی اجازت یافتہ چکلوں اور بالخصوص لائسنس یافتہ چکلوں کو بند کرنے کا قانون بنائیں"۔

رپورٹ کی اس تجویز کا منشاء صرف یہ ہے کہ اجازت یافتہ کاروبار قانوناً ختم کر دیا جائے۔ رپورٹ

خود عصمت فروشی کو خلافِ قانون قرار دینے کے حق میں نہیں ہے۔ اس گھناؤنے فعل کو خلافِ قانون قرار نہ دینے کی سفارش جن دلائل کے ساتھ کی گئی ہے وہ خاصے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

(۱) عصمت فروشی اگر قانوناً ممنوع قرار دی جائے تو لفظ 'عصمت فروشی' کی تعریف بیان کرنی پڑیگی۔ اور اس جرم کی بنا پر لوگوں کی پرائیویٹ زندگی میں خواہ مخواہ قانون کو مخل ہونا پڑے گا،

(۲) جرم طوائف بھی کرتی ہے اور اس کے پاس جانے والا مرد بھی۔ جب مرد پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں ہے تو آخر طوائف ہی کو قانون کا نشانہ کیوں بنایا جائے۔

(۳) عصمت فروشی میں اور نکاح کے علاوہ دوسرے جنسی تعلقات میں بس ذرا درجے ہی کا فرق ہے۔ بس لیے خاص جسیواں کو جرم قرار دینا بے انصافی ہے،

(۴) قانون کو ہر غیر اخلاقی فعل کے تدارک کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ جب معاشرے میں دوسری برائیاں موجود ہیں تو آخر جسیوائی کو قانون کی زد میں کیوں لایا جائے۔

(۵) عصمت فروشی کو اگر قانوناً جرم قرار دیا جائے تو قانون کو موثر بنانے کے لیے جاسوس پولیس کا تقرر لازمی ہوگا۔ یہ چیز عوام کے مفاد کے خلاف ہوگی،

(۶) جرم قرار دینے سے طوائفوں کے طبقہ میں انفرادی و اجتماعی معاندانہ رویہ پیدا ہوگا جس سے ان کی آباد کاری میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

یہ دلائل پڑھتے وقت آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رپورٹ کے مرتبین کو دفعتہً یہ بات یاد آگئی ہے کہ کہیں ہم عصمت فروشی کو برا کہتے کہتے اس لذیذ کاروبار کا بدھیا ہی نہ بٹھا دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مذکورہ دلائل سے اس اندیشہ کا پوری طرح سدباب کر دیا۔ عصمت فروشی انسانیت کے دامن پر ایک مکروہ دھبہ سہی لیکن اس دھبہ کو مٹانے کے لیے فرد کی آزادی پر تو بہرحال حملہ نہیں کیا جا سکتا، کوئی ان لال بجھکڑوں سے پوچھے کہ جب آپ کی نظر میں یہ فعل غیر قانونی تھا ہی نہیں تو پھر اس کے گھناؤنے پن کو دیکھ کر اور اس کے برے اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر چیں بجبیں ہونے کی ضرورت آخر کیا تھی؟ اس بحث کے بعد لائسنس یافتہ چکلوں کو بند کرنے کی آپکے پاس اخلاقی دلیل کونسی باقی رہ جاتی ہے؟ — ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ مندرجہ بالا دلائل سے چند سطریں پیشتر یہ اعتراف بھی موجود ہے :-

"اجازت یافتہ عصمت فروشی کے انسداد اور لائسنس یافتہ چکلوں کے بند کرنے سے پوشیدہ کاروبار میں اضافہ ہوگیا ہے اور ایسی طوائفوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جو اپنا کاروبار کھلے بازاروں میں کرنے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۶ء کے انسدادی قانون سے اسپین میں پوشیدہ چکلے زیادہ ہوگئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۵۹ء میں چلی میں چکلے بند کرنے کے نتیجہ میں جسیواؤں نے کھلی شاہراہوں پر لوگوں کو ترغیب دے دے کر اپنا کاروبار چمکا لیا ہے۔"

قانونی پہلو کے بیان کرنے کے بعد رپورٹ میں چند مخصوص تجاویز پیش کی گئی ہیں، مثلاً

۱۔ معاشرتی و اقتصادی حالات کی بہتری کی کوشش خصوصاً نچلے طبقہ میں،

۲۔ رہائش کے مسئلہ کو حل کیا جائے اور غیر منکوحہ عورتوں کے لیے حتی الوسع علیحدہ کوارٹر تعمیر نہ کیے جائیں بلکہ خاندانوں کو ترجیح دی جائے،

۳۔ عورتوں اور مردوں کا سیاسی و قانونی و معاشرتی اعتبار سے درجہ برابر رکھا جائے اور دونوں کو تمام حقوق یکساں دیئے جائیں۔

۴۔ اسکولوں اور کالجوں میں جنسی و ذہنی حفظانِ صحت کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۵۔ ملازمتوں کی تلاش میں عورتوں کی مدد کی جائے۔

۶۔ نائٹ کلبوں اور ناچ گھروں کی کڑی نگرانی کی جائے۔

۷۔ حاجتمند و مسافر عورتوں کی حفاظت اور امداد کا انتظام کیا جائے۔

۸۔ ایک ہی کام کرنے والے مرد و عورت کو برابر تنخواہ دینے کا اصول رائج کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

ان سفارشات میں غریب طبقے کے حالات کی بہتری کی تجویز کو چھوڑ کر، کہ جس کے اہم ترین ہونے میں شبہ نہیں، دور رس نتائج پیدا کرنے والی تجاویز وہ ہیں جو عورتوں اور مردوں کے دائرہ کار و حقوق میں امتیاز ختم کرنے کی داعی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا عصمت فروشی کی اس وبا کے پھیلانے میں اگر کوئی چیز ممد و معاون ہے تو وہ یہی امتیاز ہے جہاں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں اور انھیں ملازمتیں فراخدلی سے مہیا کی گئیں، بس اس کے بعد نہ عورتیں عصمت بیچنے پر آمادہ ہوں گی اور نہ مرد عصمت خریدنے پر مائل ہوں گے۔ اتنی اہم سفارش کسی گذشتہ تجربہ یا کسی دلیل کی روشنی میں نہیں دی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس شہادت خود رپورٹ میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو :-

یہ دلیل دی گئی ہے کہ بہت سے ملکوں میں جہاں معاشی حالات بہت اچھے ہیں، معیار زندگی بلند ہے، تعلیم عام ہے، مردوں اور عورتوں کے حقوق برابر ہیں اور وہاں پر سوشل سروس کے بہت ترقی یافتہ پروگرام لاگو ہیں عصمت فروشی کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح جب کبھی معاشی حالات بہتر ہوئے ہیں عصمت فروشی کا طریقہ اگرچہ ضرور تبدیل ہو گیا مگر مسئلہ بدستور باقی رہا ہے۔ مالی ضروریات کے تحت جو عورتیں بازاروں میں نکلتی تھیں، ان کی تعداد اگرچہ خاصی کم ہو گئی تاہم کال گرلز (CALL GIRLS) جو عیش و عشرت کی تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے عصمت فروشی کرتی ہیں، ان کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ رائے دی گئی ہے کہ عصمت فروشی کا مسئلہ ایک طبقہ میں دولت و قوت کی خاص فاضل مقدار سے وجود پذیر ہوتا ہے اور دوسرے طبقہ میں دولت کی غیر متناسب تقسیم سے قوت پکڑتا ہے۔"

رپورٹ کے بین السطور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ جتنا شدید امریکہ و یورپ کے متمول اور عورتوں کے حقوق تسلیم کرنے والے ممالک میں ہے، اس کا عشر عشیر بھی تعلیم سے کورے، غریب مشرقی ممالک میں نہیں ہے۔ یہ بات بھی رپورٹ کے مرتبین کے علم میں ہے کہ مغربی تہذیب نے مرد و زن کے تعلقات کو بالکل غیر محدود کر دیا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جو کام پہلے رنڈی کرتی تھی اور بہرحال آبادی کا ایک عظیم تر حصہ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تہذیب کی اقدار اور معیار اخلاق بدل جانے سے وہی کام ملک کی بیشتر عورتیں کرنے لگی ہیں اور حالت یہ ہے کہ انہیں برا سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ پہلے جنسی بیماریاں شاذ و نادر ہوا کرتی تھیں اور جہاں کہیں ان کے اثرات پائے جاتے تھے وہ بیشتر رنڈیوں ہی کی وجہ سے ہوتے تھے لیکن اب 'مہذب' ملکوں میں جنسی بیماریوں کی وہ کثرت ہے کہ ان کا تدارک ممکن نظر نہیں آتا اور ان کے پھیلانے کے مراکز جو پہلے رنڈیوں کے کوٹھوں تک محدود تھے، اب اتنے پھیل چکے ہیں کہ اس ضمن میں رنڈیوں کا ذکر اب بے معنی ہو گیا ہے۔ چنانچہ جنسی بیماریوں کے تدارک کے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ :-

"اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہے کہ ادھر کئی سالوں سے جنسی برتاؤ میں ایک عام سماجی انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ معیار اخلاق گر جانے سے بہت سارے ملکوں میں سماج اس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ وہاں جنسی بیماریوں کے پھیلانے میں رنڈی اب کوئی موثر عامل نہیں رہی۔ مثال کے طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بالخصوص یورپ اور شمالی امریکہ کے بعض حصوں میں خوش وقت لڑکیوں (GOOD TIME GIRLS) کا ایک طبقہ

وجود پذیر ہو گیا ہے۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں اس لیے آزاد جنسی روابط قائم کر کے زندگی گزارتی ہیں کہ یہ روابط انہیں اپنی دل پسند عشرتوں کے حاصل کرنے اور مرد کی رفاقت مہیا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔

"اس بنا پر وہ روایتی تصور کہ بیسوا جنسی بیماریوں کے پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے، بہت سے ملکوں میں اب پرانا ہو چکا ہے۔ پیشہ ور رنڈی کے مقابلہ پر اب آزاد و بے قید عورت آ گئی ہے۔ اسی لیے اب پیشہ ور رنڈی کی طرف رجحان بھی کم ہو رہا ہے۔ بہت سے علاقوں میں نوجوانوں کے لیے جنسی خطرہ پیشہ ورانہ عصمت فروشی کی بجائے آزاد جنسی اختلاط کی طرف سے ہے۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۵۶ء میں اسٹاک ہالم میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس اس نتیجہ تک پہنچی تھی کہ جنسی بیماریوں کی چھوت نئی تہذیب کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ بے قید جنسی تعلقات کے ذریعے پھیل رہی ہے۔"

یہ بتا کر کہ سامنے ایک مہیب کھڈ ہے، رپورٹ جب ساری دنیا کو اس میں چھلانگ لگانے پر اکساتی ہے تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کا یہ کمیشن کیا واقعی زیر غور مسئلہ کے حل کرنے میں سنجیدہ ہے؟ اور کیا اس کی پیش کردہ سفارشات متوقع اثرات کی حامل ہو سکتی ہیں؟ ماننا پڑے گا کہ یا تو مرتبین کی نظر میں مسئلہ بہت زیادہ اہم نہ تھا (جس کا امکان بہت کم ہے) یا انہوں نے مسئلہ کے بعض موثر پہلوؤں سے صرف نظر کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ رپورٹ کی یہ دلچسپ خصوصیت بھی ہے کہ مسئلہ زیر بحث کے عوامل میں یا لائحہ عمل میں اخلاقیات کا نام کہیں نہیں آیا۔ اتنی اہم بات، ظاہر ہے، سہواً نہیں رہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹ مرتب کرنے والے اس بات پر پوری طرح مطمئن رہے ہیں کہ اگرچہ طوائف کا کام اپنی خاص ہیئت میں انسانی شرف کے منافی ہے، تاہم دائرہ نکاح سے باہر کے دوسرے صنفی تعلقات بہرحال نہ تو انسانیت کے معیار اخلاق سے فروتر ہیں اور نہ ان کا بکثرت پایا جانا کچھ ایسا تشویشناک ہی ہے، اسی لیے کوشش کے باوجود کوئی ایسی سفارش رپورٹ میں نظر نہیں آتی جس میں حکومتوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہو کہ وہ مرد و زن کے صرف جائز تعلقات کی ہمت افزائی کریں اور ایسی تہذیبی روایات یک قلم منسوخ کر دیں، جو ناجائز صنفی تعلقات پر منتج ہو سکتی ہوں۔

جہاں تک زیر بحث مسئلہ میں اخلاقیات کے دخیل ہونے کا تعلق ہے، اس کے واضح ہونے سے شاید ہی کوئی انکار کرے۔ قوموں کی معاشرتی زندگی میں سب سے بنیادی سوال یہی آتا ہے کہ اس میں مرد و زن کا تعلق کس بنیاد پر قائم ہے۔ اسی مرکزی سوال کے مختلف جوابات سے قوموں کی معاشرت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ جب مرد و زن کا صنفی تعلق ایک ایسے پاکیزہ رابطہ ہی سے قرار پاتا ہو جس کی پاکیزگی پر پورے کا پورا معاشرہ گواہی دے، تو اس پاکیزہ رابطہ سے ہٹ کر صنفی تعلق کی جو بھی کوشش کی جائے گی۔ معاشرہ کا ایک ایک فرد اس سے نہ صرف نفرت کرے گا بلکہ اس سے ایک قلبی و روحانی کرب محسوس کرے گا۔ ایسے معاشرہ میں ناجائز تعلق کی معصوم سے معصوم شکل بھی پنپنے کا موقع نہیں پا سکتی۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ میں مرد و زن کے روابط پر کوئی قید نہ ہو، وہاں صنفی تعلق کی ہزار قسمیں رائج ہو سکتی ہیں۔ اگر ان میں سے بعض قسموں کو دیکھ کر کچھ لوگوں کی پیشانی پر بل بھی آجائیں، جب بھی ان قسموں کو ناپسندیدہ و غیر مطلوب قرار دینا کچھ عجیب سا ہو گا، کیونکہ اس معاشرہ کے معیار اخلاق سے بہرحال وہ تعلق متناقض نہ ہو گا۔ بالفرض کچھ "شرفاء" اگر کسی خاص شکل کو روک بھی دیں، جب بھی بیسیوں نئی سے نئی اور غیر مضر شکلوں کو اختیار کر لینا اس معاشرہ میں کون سا مشکل کام ہے —— رپورٹ کے مرتبین کے سامنے شاید صرف مغربی تہذیب ہی کا معیار اخلاق رہا ہے۔ اسی لیے انھیں عصمت فروشی کو ناجائز قرار دینا ناممکن نظر آتا ہے اور وہ سوال کرتے ہیں کہ جب معاشرہ کے اندر دائرہ نکاح سے باہر کے بیسیوں قسم کے تعلقات پر کوئی پابندی نہیں ہے تو آخر عصمت فروشی کی اسی خاص شکل پر قدغن لگانے کے کیا معنی؟ گویا یہ طے ہے کہ باقی سارے تعلقات عین صواب ہیں۔

اس مسئلہ میں اخلاقی پہلو اس قدر اہم ہے کہ اس کو نظر انداز کر کے رپورٹ نے اپنی وقعت گھٹا دی ہے۔ عصمت فروشی کے قلع قمع کے لیے اگر کوئی موثر تجویز سامنے آئی ہے تو کمیشن نے اسے ضرورت سے سخت اقدام کہہ کر رد کر دیا ہے۔ فرض کیجیے کہ کمیشن کی رحمدلانہ سفارشات کے نتیجہ میں بیسوا پن ختم بھی ہو جاتا ہے، جب بھی رپورٹ کا انداز کچھ اسی قسم کا ہے کہ عصمت فروشی کی ہر دوسری شکل کی گویا تصویب ہو رہی ہے۔ یہی بیسوا پن اگر کسی دوسرے بھیس میں آجائے تو انسانیت کی عظمت و شرف سے متناقض ہونا تو کجا، ثقافت و آرٹ کے نقطہ نظر سے قابل فخر چیز گردانا جائے گا۔ عورتوں کی کھلی آزادی کی سفارش کر کے تو کمیشن نے دوسرے الفاظ میں گویا اسی برائی کا دروازہ چوپٹ کھول دینے کی سفارش کر دی ہے۔ (باقی بر صفحہ ۲۳)

بقیہ "تذکرہ و تبصرہ"

اس انقلاب کے پہلے مرحلہ میں سکندر مرزا صاحب ایسی نوعیت سے سامنے آئے کہ بظاہر یہ انقلاب ان کا کارنامہ نظر آیا لیکن معاً ان کا جو حشر ہوا اس نے واضح کر دیا کہ انقلاب کی بانی درحقیقت فوج تھی نہ کہ مرزا صاحب۔ ہمارے نزدیک فوج نے یہ اقدام محض ملک کو انتشار اور بدنظمی سے بچانے کے لیے کیا۔ اس کے اندر نہ تو قوم کے ہاتھوں سے اقتدار کو غصب کرنے کی کسی خواہش کو دخل تھا اور نہ سرحد پار کے لوگوں کے ساتھ اس مقصد کے لیے کوئی سازش یا جتھہ بندی کی گئی تھی۔ جو لوگ اس قسم کا گمان رکھتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے۔ جمہوریت بلاشبہ ایک مطلوب و محبوب چیز ہے، لیکن خود ملک کی سلامتی جمہوریت سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے نزدیک فوج نے خطرہ کے آخر وقت میں ملک کو بچانے کا وہ فرض انجام دیا جو اس پر عائد ہوتا تھا۔ اگر اس وقت فوج یہ اقدام نہ کر گذرتی تو وہ ایک ایسی کوتاہی کی مرتکب ہوتی جس کی تلافی شاید پھر کبھی بھی نہ ہو سکتی۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ) تو آخر ہم ان سے کس اعتبار پہ یہ سمجھتے کہ اگر ہمارے اقتدار کے غاصبین بھی اقتدار سونپ دیتے تو ہم جمہوریت کو کامیابی کے ساتھ نہ چلا سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال محض خوش فہمی اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ بھارت میں گاندھی جی اور متعدد چوٹی کے لیڈروں کے مرجانے کے باوجود آج بھی نصف درجن سے زیادہ ایسے لیڈروں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو ہمارے اپنے نقطہ نظر سے اچھے ہوں یا برے لیکن اپنی قوم اور اپنے ملک کے وہ نہایت قابل اعتماد لیڈر ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ وہ حکومت کو چلا سکتے ہیں۔ برعکس اس کے ہمارا حال یہ ہے کہ لیاقت علی خاں مرحوم کے بعد کوئی شخص ان صلاحیتوں کا حامل بھی نہ اٹھا جو لیاقت علی خاں کے اندر تھیں، فخر کرنے کو آپ جس کا جی چاہے لے کر وہ جواہر لال، راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد، پنت، جے پرکاش اور ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ سب سے بڑا لیڈر ہے لیکن اس قسم کی خود فریبیوں سے قوموں کی مشکلیں نہیں حل ہوا کرتیں۔ پھر انگریزوں سے حقوق حاصل کرنے کی جنگ میں ان کے لاکھوں آدمیوں کو یہ تربیت بھی اچھی طرح مل ہوئی ہے کہ قومی حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے۔

[1] ہمیں ان حضرات کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو ملازمین سرکار کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں "قوم کے نمائندوں" کے ماتحت صرف نوکری کرتے رہنا چاہیے اگرچہ یہ نمائندے حضرات سارے ملک کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سوال نمبر ۲:- ان اسباب یا ایسے ہی دوسرے اسباب کے پھر رونما ہونے کا سدباب کرنے کے لیے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب:- اس سوال کا ایک جواب تو یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ جب اس ملک کے عوام میں نہ صحیح قسم کی سیاسی بیداری ہی موجود ہے اور نہ یہاں قوم پرور سیاسی پارٹیاں ہی موجود ہیں تو بہتر تو یہی ہے کہ جس طرح آئین اور جمہوریت کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جا چکی ہے اسی طرح یہ بساط لپیٹی ہوئی پڑی ہی رہے۔ اور اگر جمہوریت کی نمائش کسی حد تک ضروری ہی سمجھی جائے تو اس کی کوئی ایسی معصوم سی شکل یہاں کے لیے تراشی جائے جس سے یہاں کے کم علم اور کم فہم عوام مانوس ہو سکیں۔

لیکن ہمارے نزدیک اس سوال کا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ جن لوگوں نے دستور کو معطل کیا ہے ان کے پیش نظر انتشار کو ختم کرنا تھا نہ کہ جمہوریت کو، اس وجہ سے ان کا فرض ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کو بحال کریں اور بالکل صحیح معنوں میں بحال کریں۔ آزادی اور جمہوریت ہمارے نزدیک دونوں ہم معنی حقیقتیں ہیں۔ اگر کسی ملک کے عوام آئین اور جمہوریت سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو بالفاظ دیگر وہ آزادی سے محروم کر دیئے گئے ہیں اور آزادی سے محرومی کسی حال میں بھی برداشت کیے جانے کے لائق چیز نہیں ہے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں عوام میں نہ صحیح سیاسی شعور موجود ہے اور نہ کوئی صحیح قسم کی قیادت موجود ہے لیکن یہ دونوں چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہو۔ ایک ایسی قوم کے اندر جو آزاد ہو چکی ہو اور جو اپنی آزادی کو باقی بھی رکھنا چاہتی ہو، ان دونوں چیزوں کا پایا جانا اس کے سیاسی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ گندم، لوہا، پانی اور بجلی ہر چیز کے بغیر ایک قوم اپنی آزادی کا تحفظ کر سکتی ہے لیکن صحیح سیاسی شعور اور بے غرض قیادت کے بغیر کوئی قوم دنیا میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی اس وجہ سے آئین کمیشن کو بہرحال ایک ایسے آئین کا نقشہ تیار کرنا ہے جو نہ صرف اس قوم کو صحیح جمہوری زندگی کی آزادیاں بخشے بلکہ ساتھ ہی ان چیزوں کا بھی اہتمام کرے جو اس جمہوری زندگی کو صحیح نہج پر چلائے اور اس کو ترقی دینے کے لیے اساس کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مقصد مندرجہ ذیل

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) رکھ دیں۔ اگر ملک میں جمہوریت وقار اور ایمانداری کے ساتھ چلتی رہی ہو تب تو سرکاری ملازمین کے لیے یہ جائز رہا ہے کہ وہ ملک کی سیاست سے بالاتر رہیں لیکن اگر وہ ملک کو تباہ ہوتے دیکھیں اور صرف قوم کے خائنوں کی ماتحت گزاری کرتے رہنے پر قانع رہیں تو ہماری نظروں میں ایسے سرکاری ملازمین کی نوکری کی تنکے کے برابر زیادہ قیمت نہیں۔

تدابیر اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱) یہاں انگریزی نظام یا امریکی دستور کی نقالی کرنے یا سابق دستور کی طرح کفر اور اسلام دونوں کا ایک مرکب دستور بنانے کے بجائے سو فیصدی ایک اسلامی دستور بنایا جائے۔ ایک خالص اسلامی دستور اپنی فطری سادگی کے سبب سے یہاں کے عوام کے لیے قابل فہم اور قابل عمل بھی ہو گا اور ان کے دل کی تمناؤں کے مطابق ہونے کے سبب سے ان کی عقیدت اور ان کے احترام کا مرجع بھی بن سکے گا۔ اس کے لیے ملک کے عوام کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو گا کہ خود بھی اس کے ہر اصول کا احترام کریں اور اپنے لیڈروں اور حکمرانوں سے بھی اس کا احترام کرائیں۔ یہ چیز قوم کے ایک بہت بڑے طبقہ کے اندر وہ مذہبی و سیاسی بیداری پیدا کرے گی جو صحیح جمہوریت کے قیام و بقا کی پہلی شرط ہے۔

(۲) اگر کمیشن یہ معلوم کرنا چاہے کہ ایک صحیح اسلامی دستور کے بنیادی اصول کیا ہیں تو اس کا آسان راستہ یہ ہو سکتا ہے کہ جنوری سنہ ۵۱ء میں اس ملک کے مختلف مکاتب خیال کے علماء نے متفقہ طور پر جو اصول طے کر دیئے تھے وہ ان کو اپنے سامنے رکھ لے۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ مسائل باقی رہ جائیں تو وہ ملک کے جید اور صاحب فکر علماء سے تبادلہ خیال کر کے یا ایک سوال نامہ کے ذریعہ سے اہل علم کی رائیں معلوم کر کے طے کیے جا سکتے ہیں۔

(۳) اس دستور میں نہایت وضاحت کے ساتھ وہ تدابیر معین کر دی جائیں جو اس ملک میں صحیح قسم کی اسلامی قیادت کی تربیت کے لیے اس ملک کی ریاست کو اختیار کرنی ہوں گی۔ یہ واضح رہے کہ ایک اسلامی ریاست کے فرائض انجام دینے یا اس کے اندر قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اس سے مختلف صفات مطلوب ہوا کرتی ہیں جو ایک عام ریاست کی خدمت کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔ اسلامی ریاست چلانے والوں کے لیے نمونہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی زندگی ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ریاست اس نمونے کے اشخاص پیدا کرنے کا اہتمام خود کرے تاکہ اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اہل اشخاص اس کے اداروں سے برابر پیدا ہوتے رہیں۔

(۴) اس دستور کی عوام سے منظوری حاصل کی جائے[۱] تاکہ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ یہ دستور ان کے

[۱] یہ امر واضح کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دستور کے معاملہ میں ہم صرف بیسک ڈیموکریسی میں منتخب ہونے والے نمائندوں ہی کی منظوری کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس مسئلہ پر ہر بالغ کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔

اور حکمرانوں کی طرف سے لادا نہیں گیا ہے بلکہ اس کو انھوں نے خود منظور کیا ہے۔ یہ منظوری استصواب عام کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے جس میں انھیں اس بات کی پوری آزادی دی جائے کہ اگر انھیں یہ دستور بحیثیت مجموعی پسند ہو تو اس کو قبول کریں اور اگر بحیثیت مجموعی ناپسند ہو تو اس کو رد کر دیں۔

۵۔ اس دستور کو پیش کرنے، اس کو پبلک سے منظور کرانے اور اس کو اس ملک میں نافذ کرنے کے ہر مرحلہ میں موجودہ حکمران اس دیانتداری اور بے لوثی کی عملی مثال پیش کریں جو ایک اسلامی مملکت کی قیادت کے شایان شان ہے، تاکہ یہ عملی نمونہ دوسروں کے لیے مثال بن سکے اور آئندہ کام کرنے والوں کو ماضی کی غلط روش کے بجائے ایک جانقطۂ آغاز پیروی کے لیے مل سکے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ چیزیں ان بہت سی خرابیوں کا سدباب کر دیں گی جو ماضی میں اس ملک میں پیدا ہو چکی ہیں اور جن کے سبب سے اس کی سیاسی زندگی تباہ ہوئی ہے۔

سوال نمبر ۳۔ مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں آپ جن نتائج تک پہنچے ہیں ان کی روشنی میں:

(۱) کیا آپ پارلیمانی نظام حکومت کو ترجیح دیتے ہیں یا صدارتی طرز حکومت کو؟

(۲) کیا آپ وحدانی طرز حکومت کے حق میں ہیں یا وفاقی طرز حکومت کے حق میں؟

جواب: اسلامی نظام حکومت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو پارلیمانی نظام حکومت ہو یا صدارتی طرز حکومت، ان میں سے کوئی نظام حکومت بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم بعینہٖ اپنے لیے اختیار کر سکیں۔ ان دونوں کے اندر خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ لیکن ہمارے لیے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے ساتھ ان کا میل ہے یا نہیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی میل نہیں ہے۔ اسلامی نظام حکومت کی روشنی میں ان پر مفصل تنقید کے لیے تو اس مختصر جواب نامہ میں گنجائش نہیں ہے لیکن ان دونوں کے اندر اسلامی پہلو سے جو بڑے بڑے نقص ہیں، ہم بالاجمال ان کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں۔

پہلے پارلیمانی نظام حکومت کو لیجیے:-

اس نظام میں عملاً تو تمام اختیارات وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی لازماً اس میں

ایک نمائشی (HEAD OF STATE) صدر حکومت یا بادشاہ بھی ہوتا ہے جو وزراء کا تقرر اور ریاست کے بعض دوسرے رسوم ادا کرتا اور ادا کراتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے کسی نمائشی گڈے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو صدر ریاست یا خلیفہ ہوتا ہے اسی کو وہ تمام حقیقی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو حکومت کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ اسلامی نظام پارلیمانی نظام کی اس غیر فطری ثنویت سے بالکل پاک ہے اور اس کا مزاج کسی شکل میں بھی اس چیز کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس میں دوسری خرابی اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ یہ نظام درحقیقت پارٹی گورنمنٹ سسٹم ہے، جو پارٹی لیجسلیچر کے اندر اکثریت حاصل کر لیتی ہے ریاست کا نمائشی صدر یا بادشاہ اسی کے لیڈر کو حکومت بنانے اور چلانے پر مقرر کرتا ہے۔ اکثریت کی پارٹی کا لیڈر وزیر اعظم بنتا ہے اور وہ اس وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک اس کو ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔ یہ پارٹی سسٹم نہ ہو تو یہ نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ لیکن اسلامی نظام اس پارٹی سسٹم کا محتاج نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ پارٹی سسٹم اصولاً اسلامی نظام حکومت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کو اپنے نظام حکومت کی بنیاد بنانے کے بجائے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح وہ صدارتی طرز حکومت بھی جو امریکہ میں رائج ہے اسلام کے طرز حکومت کے بالکل خلاف ہے۔ اول تو عاملہ اور مقننہ کے درمیان اس قسم کی شدید حد بندی جس قسم کی حد بندی صدارتی نظام میں ضروری سمجھی گئی ہے اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں خلیفہ قانون سازی (جس حد تک قانون سازی میں انسانوں کا دخل جائز ہے) کے معاملات میں براہ راست حصہ (DIRECT INITIATIVE) لے سکتا ہے۔ وہ جو قانون مفید سمجھے شرعی حدود کے اندر اس کو اپنی شوریٰ کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو وہ مجلس قانون ساز کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں لمبی سے لمبی تقریر بھی کر سکتا ہے۔

ثانیاً صدارتی نظام میں ایک مرتبہ صدر کے منتخب ہو جانے کے بعد اس کی مقررہ مدت صدارت تک جو آزادی و بے قیدی اور جو غیر مسئولیت اس کے لیے تسلیم کر لی گئی ہے اسلام اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ صدارتی نظام میں صدر جب ایک مرتبہ صدر بن گیا تو اس کے عہدہ کی مدت کے اندر کوئی اس کو اس کی جگہ سے ہلا

نہیں سکتا اگرچہ ملک کا ایک ایک ووٹر مطالبہ کر رہا ہو کر اس کو ہٹایا جائے۔ مجلس قانون ساز اس کے غلط سے غلط اقدام پر بھی کوئی گرفت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو بس یہ کر اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کرے اور اڑنگے ڈالے لیکن ان رکاوٹوں اور اڑنگوں سے صدر کی مطلق العنانی میں تو مشکل ہی سے کوئی فرق پیدا ہوتا ہے البتہ ملک کی سیاسی زندگی میں بہت سی ناہمواریاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسلام خلیفہ کے لیے اس قسم کی غیر مسئولیت ایک لمحہ کے لیے بھی جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اگر آج خلیفہ کا انتخاب ہو اور کل اس کے منتخب کرنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص اس منصب کے لیے نااہل ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔ کم از کم قانون میں اس معزولی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ چند باتیں ہم نے محض بطور اشارہ عرض کی ہیں ورنہ یہ دونوں نظام مختلف پہلوؤں سے اسلامی نظام سے اس قدر بے جوڑ ہیں کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا کوئی ارادہ ہو تو ان میں سے کسی کے اختیار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(۲) وفاقی یا وحدانی نظام حکومت جہاں تک جواز کا تعلق ہے یہ دونوں ہی اسلام میں جائز ہیں۔ سوال جو کچھ ہے وہ صرف ہمارے مصالح کا ہے۔ ہمارے مصالح ان میں سے جس نظام کے لیے متقاضی ہوں وہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے بربنائے مصالح ہمارا رجحان وحدانی طرز حکومت کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وفاقی طرز حکومت کے جو فوائد گنائے جاتے ہیں وہ تو یہاں مطلوب نہیں ہیں اور اس کے جو نقصانات ہیں ان کے نہایت تلخ تجربات ہم کر چکے ہیں۔ مقامی مفادات و رجحانات میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہمارے علم میں نہیں ہے جس کی کوئی حقیقی اہمیت ہو کس وجہ سے ملک کے استحکام کو مقامی میلانات و رجحانات پر ترجیح دی جا سکے۔ اگر کچھ مقامی مفادات (LOCAL INTERESTS) ایسے نظر آئیں جو واقعی ہوں اور جن کو وحدانی طرز حکومت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ان کے لیے وہ تدبیریں اختیار کی جائیں جو ایک وحدانی نظام حکومت میں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں۔ (باقی آئندہ)

جون کے دوسرے ہفتہ میں **اسلامی دستور** کے عنوان پر

ہفت روزہ **المنبر** لائل پور اشاعت خاص پیش کر رہا ہے۔

مضامین و مقالات کی ایک جھلک

لاء کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات	مولانا مفتی محمد شفیع
طلوع اسلام کے دستوری خاکے پر ایک تنقیدی نظر	مولانا سید محمد داؤد غزنوی
اسلامی دستور سازی کے ماخذ	مولانا قاری محمد طیب
اسلامی قانون میں حدیث کا مقام	مولانا احمد علی صاحب
اجتہادی مسائل میں راہ اعتدال	مولانا عبدالغفار حسن
صدر مملکت کے حقوق و فرائض	علامہ محمد اسد
حسن البناء شہید کا ایک تاریخی خط	جناب ماہر القادری
اسلامی دستور کی اہم دفعات	جناب مصطفیٰ صادق
اسلامی دستور اور معاشرہ	پروفیسر غلام مرتضیٰ

اس کے مطالعہ سے آپ آئین کمیشن کے سوالنامے کا صحیح جواب دے سکیں گے

اس اشاعت کی قیمت چار آنے — سالانہ چندہ چھ روپے

نیز اسلامی قانون کے مسلمہ ماہر مولانا امین احسن اصلاحی کے وہ جوابات بھی شریک اشاعت کئے جا رہے ہیں جو آپ نے دستور کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں دئیے ہیں